...گ عظیم دوئم : برما محاذ کی سرگذشت

شُتر غمزے

اک پنجابی کسان کا بیٹا جسے برٹش انڈین آرمی میں افسری ملی مگر..........

میجر اسحاق محمد

شتر غمزے

میجر اسحاق محمد

N

1944ء: میجر اسحاق ملٹری کراس لیتے ہوئے

یہ کتاب ایسے پنجابی کی داستان ہے جن کا پس منظر دیہاتی تھا۔ 1942 [illegible]
وہ فوج میں گئے اور نہ صرف ملٹری کراس حاصل کیا بلکہ کلکتہ میں [illegible]
کے اے ڈی سی بھی رہے۔ وہ ایک طرف بدلتی ہوئی عسکری [illegible] کے
گواہ تھے تو دوسری طرف انہیں فوج اور عام آدمی کے درمیان [illegible]
فاصلوں بارے شدید تحفظات تھے۔ اس کتاب [illegible] گہری نظر [illegible]
کتاب سیاسی کارکنوں اور عسکری ماہرین دونوں کیلئے خاصے کی [illegible]

N نیولائن پبلشرز [illegible]
E3/8 [illegible] 6 [illegible] 0300 6662196 [illegible]

جنگِ عظیم دوئم: برما محاذ کی سرگذشت

شُتر غمزے

اِک پنجابی کسان کا بیٹا جسے برٹش انڈین آرمی میں افسری ملی مگر............

میجر اسحاق محمد

نیولائن 042-36662196

نیولائن
پرنٹر، پبلشر، ڈسٹری بیوٹر

ای 3/8، سٹریٹ نمبر 6، کیولری گراؤنڈ لاہور کینٹ
فون 042-36662196
E-mail: newline2100@yahoo.co.uk

کاپی رائٹ © ڈاکٹر مقبول اختر

نام کتاب: شُتر غمزے
مصنف: میجر اسحاق محمد
تاریخ اشاعت: جنوری 2010ء
پبلشر: نیولائن پبلشرز
ٹائٹل: عمانوایل اقبال
پرنٹنگ: اکرم پریس

قیمت:- 100/ روپے

اس کتاب کے ناشر نیولائن پبلشرز ہیں۔ اس کتاب کی تیاری اور تقسیم کی تمام تر ذمہ داری نیولائن پبلشرز پر عائد ہوتی ہے۔ اگر آپ اس کتاب کو کسی بھی سطح پر استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے لیے تحریری اجازت لینا ہوگی۔ بصورت دیگر نیولائن پبلشرز کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت اپنا قانونی حق محفوظ رکھتے ہیں۔ پبلشرز کا مصنف کے نقطہ نظر سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

انتساب

شَند کے نام

رشید اصغر شند ایم اے ایل ایل بی میجر صاحب کے بھانجے اور ڈاکٹر مقبول اختر کے بڑے بھائی تھے۔ میجر صاحب سے بہت پیار اور دوستی کا رشتہ تھا۔ بچپن میں ایک اردلی آواز دیا کرتا تھا "رشید احمند۔ شند۔ یہی پیار کا نام پڑ گیا۔

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ راہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے
(فیض)

فہرست

کتاب بارے اِک تحریر	عامر ریاض	7
عذرِ گناہ........	ڈاکٹر مقبول اختر	11
میجر اسحاق کے شب و روز۔4-اپریل 1921ء 2-اپریل 1982ء		13
باعث تحریر آنکہ........		17
باب نمبر1	اک خاک نشین شہ نشین پر	21
باب نمبر2	عزرائیل کی شاگردی میں	27
باب نمبر3	زادِراہ	39
باب نمبر4	نوآموز	47
باب نمبر5	کایا کلپ	61
باب نمبر6	جلوسِ عروس	73
باب نمبر7	جنگ	85
باب نمبر8	موازنہ	131
باب نمبر9	غمزے	149

o

لو تم بھی گئے ہم نے سمجھا تھا کہ تم نے
باندھا تھا کوئی یاروں سے پیمان وفا اور
یہ عہد کہ سب عمر سدا ساتھ رہو گے
رستے میں بچھڑ جائیں گے جب اہل صفا اور
ہم سمجھے تھے صیاد کا ترکش ہوا خالی
باقی تھا مگر اس میں ابھی تیر قضا اور
ہر خار رہ دشت وطن کا ہے سوالی!!!
کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور
آنے میں تامل تھا اگر روز جزا کو
اچھا تھا ٹھہر جاتے اگر تم بھی ذرا اور

فیض احمد فیض

کتاب بارے اِک تحریر

ہر انسان کی زندگی کے ایک سے زیادہ پہلو ہوتے ہیں۔ کچھ پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں اور کچھ پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے سے تو کوئی بڑے سے بڑا بھی بچ نہیں سکا۔ ان اُدوار سے جڑی ہوئی خوبیوں، خامیوں، چھوٹی موٹی کمینگیوں اور شرارتوں سے کیسے الگ رہا جا سکتا ہے۔ یہ تو ہر انسان کی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ ہاں جب اسے کوئی گروہ (نظریاتی و غیر نظریاتی) یا ریاست اپنا ہیرو یا لیڈر قرار دے ڈالے تو معاملات ٹیڑھے ہونے لگتے ہیں۔ وہ مہاتما ہو یا قومی شاعر، کسی کامیاب انقلابی تحریک کا لیڈر ہو یا کسی بظاہر ناکام جتھے بندی کا گوریلا، آخری نتیجہ میں اس کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو "ہومر" کے دیوتاؤں کے ساتھ 700 قبل مسیح میں "اصلاح پسندوں" نے کیا تھا۔ "ہومر" کے دیوتا تو اچھے برے سبھی "فریضے" سرانجام دیتے تھے مگر اس کے بعد آنے والے "اصلاح پسندوں" نے مثالی دیوتا بنانے کے چکر میں دیوتاؤں سے منسوب "خرافات" کو دیس نکالا دے دیا۔ ہمارے ہاں بھی پرانے قصوں میں ایسے اوتار ملتے ہیں جو نہاتی لڑکیوں کے کپڑے چھپا دیتے تھے۔ تاہم بعدازاں، یہ قصے بھی "اصلاح پسندوں" کی نذر ہو گئے۔ مثالی دیوتا اُسارنے والے اصلاح پسندوں نے بعدازاں "مثالی انسان" بنانے کا ٹھیکہ بھی خود ہی اٹھا لیا جس کا اظہار اڑھائی ہزار سالہ تاریخ میں جابجا ملتا ہے۔ "یک رُخی" دیوتا یا انسان بنانے کا عمل "یک رُخی دنیا" بنانے سے مختلف نہیں کہ جس کا ہمیں 1992ء سے سامنا ہے۔

جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اس کے مصنف کا نمایاں ترین تعارف یہ ہے کہ وہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ سے مسلسل برسرِ پیکار اِک انقلابی رہنما تھے۔ انہیں 1951ء میں لیاقت علی حکومت نے "راولپنڈی سازش کیس" میں گرفتار کیا۔ یہ وہی مقدمہ تھا جس کے ذریعے جنرل ایوب خان نے افواج پاکستان میں اپنے "مخالفین" کو وزیراعظم کی آشیرباد سے "نکرے" لگایا۔ زحمت میں رحمت کے مصداق رہائی ملنے (1955) اور میجری چھوٹنے کے بعد مصنف نے سیاست کا رُخ کیا اور

خوب نام کمایا۔ یوں عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی سے ہوتے ہوئے مزدور کسان پارٹی (MKP) تک بات پہنچی۔ سیاسی و نظریاتی اختلافات رکھنے والے بھی مصنف کی اَنکھ، جرأتِ انکار اور استقلال کے قائل ہیں۔ البتہ انہیں میجری سے ہٹا کر فوج نے اِک ایسا عسکری ماہر کھو دیا جو نہ صرف بعد از جنگِ عظیم دوئم بدلتی ہوئی عسکری تکنیک، کا گواہ تھا بلکہ سیاست اور معاشرت پر بھی گہری نظر رکھتا تھا۔ ترقی پسند و انقلابی رہنما اسحاق محمد کی زندگی کا یہ وہ پہلو ہے جو ان کے سیاسی و نظریاتی پرستاروں و مخالفین سے بھی تا حال پوشیدہ ہے۔

جن خطوں پر آج پاکستان مشتمل ہے یہاں تنخواہ دار فوج کا جزوی رواج تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ دَور (1839-1799) سے ہوا تھا۔ 29 مارچ 1849ء کو پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد تاج برطانیہ نے ''فرنٹیئر فارورڈ پالیسی'' کے تحت سرگودھا، جہلم سے پشاور کے نواح تک کے علاقوں کو ''عسکری نرسری'' بنایا اور کلکتہ میں اُساری گئی رائل بنگال آرمی کی مرحلہ وار تطہیر کا عمل شروع کر دیا۔ رائل بنگال آرمی میں تو بنگال، مہاراشٹر، یوپی، سی پی کے لوگ بھرتی تھے جبکہ اب فوج میں بھرتی کا قرعہ جہلم، چکوال، سرگودھا، کوہاٹ اور اٹک وغیرہ کے نام نکلا۔ عسکری نقطہ نظر سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بنائے ہوئے شہر راولپنڈی کو اس نئی فوج کا ہیڈ کوارٹر قرار دیا گیا جسے عرفِ عام میں ہیڈ کوارٹر آف نادرن کمانڈ کہا جاتا رہا۔ بس 1857ء کی نام نہاد جنگِ آزادی تو اسی تطہیر کا ردِ عمل تھا۔

98 سالہ انگریزی دَور میں ایک مکمل جدید فوج بنانے کا کام شروع ہوا تو دوسری طرف جدید صنعتی انقلاب کے ثمرات بھی ان خطوں میں پڑنے لگے۔ برابر کی عسکری قوت رکھنے والے دو متحارب قبائل یا طاقتیں اکثر براہ راست تصادم سے بچنے کے لیے ایک علاقہ خالی چھوڑ دیتے ہیں جہاں ان کی سرحدیں مل رہی ہوں۔ اگر کوئی ریاست درمیان ہو تو پھر اسی کو درمیانی علاقہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ عرفِ عام میں اسی کو ''بفرزون'' کہتے ہیں۔ پنجاب پر قبضہ سے قبل سلطنت برطانیہ اور زار روس میں ''لاہور دربار'' کی حیثیت اس بفرزون جیسی تھی۔ تاہم 1848ء میں برطانیہ کے دارالعوام میں ہونے والے مباحث گواہ ہیں کہ بعد از مہاراجہ رنجیت سنگھ تاج برطانیہ اس ''بفرزون'' کو کم سے کم کرتے ہوئے زار روس کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتی تھی۔ پہلے پنجاب پر قبضہ کیا گیا اور بعد ازاں پنجاب کی باجگوار ریاستوں اور علاقوں کی طرف پیش قدمی کی گئی۔ 1895ء میں یہ پیش قدمی اس وقت کامیابی سے ہمکنار ہوئی جب ڈیورنڈ لائن معاہدہ پر افغانستان کے بادشاہ نے دستخط کر دیئے۔ یہی وہ معاہدہ تھا جس کی بابت قبائلی علاقہ جات (FATA) پہلے برٹش انڈیا کے پاس آئے اور

بعد ازاں پاکستان کو منتقل ہو گئے۔ 1901ء میں لارڈ کرزن نے پنجاب کے چھ اضلاع کو کاٹ کر صوبہ سرحد کے نام سے نیا صوبہ بنایا تو گویا ''بفرزون'' کے علاقہ کو مزید سکیڑ دیا گیا۔

ہمارے خطہ کی عسکری تاریخ کے حوالے سے دوسرا بڑا واقعہ جنگِ عظیم اوّل (18-1914) تھی جب انہی ''نرسریوں'' سے بڑی تعداد میں لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا۔ جن علاقوں سے فوجی بھرتی کی جاتی تھی کبھی آپ وہاں کے مخصوص پنجابی لہجہ میں گائے جانے والے ٹپے اور ماہیے پڑھیں تو آپ کو وہاں وچھوڑے اور منفعت کے ملے جلے جذبات نظر آئیں گے۔ فوج میں دیسی لوگوں کی تعداد بڑھنے سے ماہیتی تبدیلی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ جنگِ عظیم اوّل تک تو فوج میں افسری انگریزوں کے لیے مختص تھی مگر دوسری جنگِ عظیم (1939) تک پہنچتے پہنچتے اس پالیسی میں دراڑیں بھی پڑنے لگی تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کی بھرتیوں نے تو پانسہ پلٹ ہی ڈالا کہ ''شودروں'' کو بھی معتبری ملنے لگی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد محض پنجابیوں کی برٹش انڈین فوج میں تعداد 40 فیصد سے زیادہ تھی۔ لگتا ہے اسی تعداد سے گھبرا کر پنڈت نہرو نے کابینہ مشن پلان کو مسترد کرتے ہوئے تقسیم پنجاب کو ضروری گردانا تھا۔ سارا جاتا دیکھئے تو آدھا دیجئے بانٹ۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ میجر صاحب 1942ء میں برٹش انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے۔ 1944ء میں ملٹری کراس لینے تک وہ جنگ کے مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ 1945ء کے تاریخی دَور میں ان کا انتخاب جنرل سر آلیور ڈبلیو ایچ لیز کے اے ڈی سی کی حیثیت سے ہوا۔ یہ جرنیل صاحب جنوب مشرقی ایشیاء کی اتحادی بری فوج کے نئے کمانڈر ان چیف تھے۔ لدھیانہ کے کھیتوں اور برما میں جاپانیوں وغیرہ سے مڈبھیڑ کے بعد یہ ان کی زندگی کا تیسرا اہم پڑاؤ تھا۔ یہاں نوجوان اسحاق محمد کو زندگی کی اصل حقیقتوں کا پتہ چلا۔ بقول میجر صاحب ''یہاں مجھے اپنی اصلی اوقات کا بہت شدت سے احساس ہوا اور اس کا بھی کہ اپنے ہی دیس میں آدمی غریب الوطن کیسے ہوتا ہے............ یہ واقعہ تھا کہ اس دیس میں ایک انگریز کو جو مراعات حاصل تھیں بڑے سے بڑا انڈین بھی ان سے محروم تھا''۔ یہی نہیں بلکہ میجر صاحب کو اپنی طبقاتی حیثیت بارے بھی خاصی آگہی ہوئی۔ آرمی چیف سے قربت کی وجہ سے بہت سے انگریز افسر انہیں کہتے تھے کہ ہمیں شکار وغیرہ پر مدعو کرو۔ اب میجر صاحب نہ جاگیردار تھے نہ نواب، وہ تو اک پنجابی جٹ کسان کے گھر پیدا ہوئے تھے۔

اس چھ ماہ کی نوکری میں میجر صاحب کو نہ صرف اربابِ اختیار کو نزدیک سے دیکھنے اور اہم فیصلے کرتے ہوئے ترجیحات کے تعین کو سمجھنے کا موقعہ ملا بلکہ بڑی طاقتوں کے عسکری مفادات کے تحت

بنائی جانے والی پالیسیوں کا بھی اندازہ ہوا۔ یہی وہ وقت تھا جب اسحاق محمد، صاحب بہادروں سے قربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس "جال" کا حصہ بن جاتے جسے عرفِ عام میں "راج نیتی" کہتے ہیں۔ طاقت کے مراکز تک تو ان کی رسائی ہو ہی چکی تھی اب ذرا اِک قدم دوسری طرف ہی ڈالنا تھا۔ میجر صاحب کے بہت سے دیسی بھائی بندوں نے ایسے مواقع کو "آخری موقعہ" سمجھ کر خوب استعمال کیا۔ تاہم میجر صاحب نے اس سے منفعت کمانے کا سوچا بھی نہیں۔ البتہ انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اربابِ اختیار کے محلات میں جھانکنے کی کوشش ضرور کی۔ ان کی یہ مختصر کتاب ایسے تجربات سے ہی بھری پڑی ہے۔ جہاں یہ کتاب یہ پتہ دے رہی ہے کہ ایک حُب الوطن فوج کیسے اُساری جا سکتی ہے۔ وہیں میجر صاحب یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ جب کسی ادارے یا سماج میں چند لوگوں یا افسروں کو مراعات اور وسائل پر قابض کر دیا جاتا ہے تو پھر قومی یکجہتی اور حب الوطنی جیسے خیالات کی کبھی توقیر نہیں ہو سکتی۔ برٹش انڈین آرمی میں گزارے چار سال (1942-46) پر محیط اس کتاب کا نام میجر صاحب نے "شتر غمزے" رکھا ہے جو بجائے خود حاصلِ مطالعہ ہے۔ اس کا لفظی مطلب تو اونٹ کی لوٹنیاں ہے تاہم یہ چوٹ ہے اس نظام پر جس میں عام آدمی کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ پاکستان کی 62 سالہ سیاسی، سماجی زندگی پر اگر نظر دوڑائیں تو میجر صاحب کی اس اصطلاح کا اثر ہر گاہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اگست 1947ء کے بعد انگریز افسروں کو جلدی جلدی رخصت کرنے کے بعد وطن عزیز کے ہر ادارے میں شتر غمزوں ہی کا راج رہا ہے۔ اپنی تحریروں کے ذریعے میجر صاحب اپنی وفات (1982) کے 25 سال بعد بھی انہی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں اور یہ کتاب اسی تسلسل کا ہی ایک حصہ ہے۔ ڈاکٹر مقبول اختر نے اس امانت کو حقداروں تک پہنچانے میں جو کردار ادا کیا وہ قابلِ تحسین ہے۔ یوں نہ صرف میجر اسحاق محمد کے پرستاروں کو ان کی زندگی کے ایک اور پہلو سے شناسائی ہوئی بلکہ عسکری ہیئت میں بھی ایک شہ پارے کا اضافہ ہو گیا۔

عامر ریاض

26-اکتوبر 2009ء

عذرِ گناہ

میجر صاحب کی وفات کے ربع صدی بعد ان کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کی اشاعت داد و تحسین کی بجائے تنقید کی مستحق ہے۔ اپنے حصے کا گناہ میں قبول کرتا ہوں۔ جن حالات میں میجر صاحب نے سیاست کی اس کے چشم دید گواہ ابھی تک موجود ہیں۔ بظاہر آزادی اور جمہوریت کے باوصف عوامی، لبرل اور بائیں بازو کی سیاست کی اجازت معدوم تھی۔ جیل و بند، قلعے تو روزمرہ کا معمول تھے۔ بہت ڈر ڈر کر چلانا پڑتا تھا۔ پارٹی ممبروں کی لسٹیں تک معدوم تھیں۔ یہاں تک کہ پارٹی پرچے "سرکلز" کے قارئین کی تحریری لسٹ بھی ناپید تھی۔ کچھ دوستوں کی اچھی یادداشت پر انحصار تھا۔

پولیس چھاپوں کا پہلا شکار تحریریں ہوتی تھیں کہ علم دشمنی ہماری گھٹی میں ہے۔ اس لیے جب میجر صاحب گرفتار ہوئے یا گرفتار ہونے کا امکان ہوتا، جو اکثر ہوتا تھا، تو سب سے پہلا کام ان کی تحریروں کو ٹھکانے لگانے کا ہوتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو ان کی کتابوں کی بھی نقل مکانی کرنا پڑتی تھی۔ بعد ازاں ان مسودات اور کتب کی بازیافت بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

اس کتاب کا علم تو تھا کہ لکھی جا چکی ہے۔ مگر ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے والا معاملہ تھا۔ تلاشِ بسیار کے بعد ایک نقل دستیاب ہوئی تو دعوے دار بہت تھے۔ ہر کوئی میجر صاحب کا جانشیں تھا، مگر باقی سب کی طرح غریب اور بے بس تھا۔ کتاب کی اشاعت کی نوبت نہ آئی اور یہ کتاب مختلف ہاتھوں میں گھومتی رہی۔ اس کی مکرر بازیافت ایک اور دشوار مرحلہ تھا۔ اس دوران میجر اسحاق صاحب کے اپنے ہاتھ کا لکھا مسودہ (نامکمل) بھی مل گیا۔ اشاعت میں مزید دیر کمپوزر حضرات کی اچھی اُردو سے ناواقفیت نے کر دی۔ فارسی کا تو ذکر ہی کیا، یہاں تو غیر فارسی بدتہذیبی کا دورہ ہے۔ زبان کے حوالے سے کاتب حضرات تو ان سے سو درجہ بہتر تھے۔ بارے اشاعت کی نوبت آئی تو اس میں

عامر ریاض کے اصرار کا بھی حصہ ہے۔ وہ پبلشر کے علاوہ ایک رسالے کا مدیر بھی ہے اور جانتا ہے لوگوں سے کیسے "لکھوایا" جاتا ہے۔ پھر انہی مقاصد کا متلاشی بھی ہے جو میجر صاحب کی زندگی کا مقصد تھے۔ اس کے علاوہ پروفیسر اشفاق بخاری بھی مسلسل دھکیلتے رہے۔

اس کتاب کی تحریر کا زمانہ آج سے کم از کم تیس سال پہلے کا ہے مگر میجر صاحب کی رائے سماجی اور سیاسی امور پر آج کے بقراطوں سے کتنی آگے اور کتنی صائب ہے اس کا فیصلہ قاری پر ہے۔

سرمایہ دار کیوں عدالتی انصاف کے حق میں ہے، جاگیردار کیوں قانون کی حکمرانی کا مخالف ہے۔ غریب ملکوں کے لیے سوشلزم کے علاوہ اور کوئی راستہ کیوں ممکن نہیں، ایک کسان کے بیٹے کی انگریزی فوج میں افسری کے علاوہ ان موضوعات پر بھی قاری کے لیے بہت مواد ہے۔

ایک آدھ مزے دار فقرہ میجر صاحب نے خود قلم زد کر دیا ہے۔ مثلاً کسان کی قدرتی مظاہر کے سامنے بے بسی دور کرنے کے لیے "اسے حضرت سائیں عزرائیل شاہ، یا سنت یم دوت مہاراج سے تعویز گنڈا ٹونا ٹوٹکا لینا پڑتا ہے"۔

ایسی باریکیوں کی تلاش میں مزید دیری کا امکان تھا، اس لیے انہیں چھوڑ دیا، اک گناہ اور سہی۔

ڈاکٹر مقبول اختر

اکتوبر 2009ء

میجر اسحاق کے شب و روز

4-اپریل 1921ء 2-اپریل 1982ء

اسحاق محمد نے 4 اپریل 1921 کو جالندھر سے سولہ سترہ میل دور ایک گاؤں "اکھاڑہ" کے غریب کسان گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد کا نام نور محمد تھا۔ وہ بالکل ان پڑھ تھے یعنی سیدھے سادے کسان تھے۔ ان کے دادا دلی میں "دیوبند" کے مولویوں سے پڑھ کر آئے تھے اس لیے انگریزوں کے بڑے دشمن تھے۔ البتہ میجر صاحب کی والدہ اس زمانے کے حساب سے پڑھی لکھی تھیں۔ انہوں نے بعد میں ان کے والد صاحب کو بھی تھوڑا بہت لکھایا پڑھایا تھا۔

میجر صاحب چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے بعد چوہدری محمد طفیل تھے جو میجر صاحب سے قبل برٹش انڈین فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ بعد ازاں وہ سبھاش چندر بوس سے متاثر ہو کر انڈین نیشنل آرمی میں چلے گئے۔ آج کل بقید حیات ہیں اور آبائی گاؤں میں رہتے ہیں۔

تیسرے نمبر پر چوہدری فتح محمد (ڈاکٹر ایف ایم چوہدری) ہیں جو مایہ ناز پیتھالوجسٹ رہے۔

پروفیسر صاحب نہ صرف فیصل آباد میں پنجاب میڈیکل کالج کے پرنسپل رہے بلکہ ملتان اور بہاولپور کے میڈیکل کالجوں میں بھی بطور پرنسپل تعینات رہے۔ میجر صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی چوہدری انور تھے جو لاہور میں وکالت کرتے تھے۔ چوہدری انور ابتدائی ایام سے ہی طلباء سیاست میں سرگرم رہے اور روز اوّل سے کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے وابستہ تھے۔ چوہدری انور کی میزبانی کی تو ایک دنیا گواہ ہے کہ ان کی محفل میں فقیر و شاہ سبھی خراماں خراماں چلے آتے تھے۔ چار بھائیوں سے بڑی تین بہنیں تھیں۔ ان میں سب سے بڑی کریم بی بی (والدہ ڈاکٹر مقبول اختر) دوسرے نمبر پر رحیم بی بی اور تیسرے نمبر پر فضل بی بی تھیں۔

اسحاق محمد نے اپنے گاؤں سے ڈیڑھ میل دور "جنڈے سراواں" کے سکولوں سے چوتھی جماعت کا امتحان پاس کیا۔ جنڈے اور سراؤں دو الگ الگ گاؤں ہیں اور یہ سکول علاقے کا پہلا پرائمری

سکول تھا۔

آٹھویں جماعت وہاں سے آٹھ میل دور ''بھوگ پور'' سے پاس کی۔ ''بھوگ پور'' سے گیارہ میل دور ''ٹانڈہ اڑمڑ'' (ضلع ہوشیار پور) سے دسویں جماعت پاس کی۔ پہلی سے دسویں تک خالص دیہی ماحول میں کرتہ اور چادر پہنے سکول جاتے رہے۔

میٹرک کے بعد ''ڈی اے وی'' کالج جالندھر سے ایف اے اور 1941ء میں ایم اے او کالج امرتسر سے بی اے کیا۔ کالج کے زمانے میں شلوار قمیض کے ساتھ سر پر پگڑی باندھتے تھے۔ ایم اے او کالج میں ڈاکٹر تاثیر پرنسپل تھے اور فیض احمد فیض انگریزی کے پروفیسر۔ فیض ایک طرف تو ان کے استاد تھے دوسری طرف یہ دونوں مل کر کامریڈ فضل الٰہی قربان سے مارکسزم پڑھتے تھے۔ کامریڈ قربان اس وقت انڈر گراؤنڈ تھے۔

اسحاق محمد نے چوتھی جماعت سے لے کر بی اے تک وظیفہ حاصل کیا۔ پیدل چل کر یا ٹوٹی پھوٹی سائیکل چلا کر رشتے داروں کے گھروں میں رہ کر علم حاصل کیا۔ اگر وہ وظیفہ حاصل نہ کرتے تو گھر والوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ ان کو آٹھویں جماعت تک بھی پڑھا لیتے۔

ایم اے او کالج امرتسر میں اسحاق محمد کو بہت اچھا ماحول ملا۔ تاثیر اور فیض جیسے استاد اور ظہیر کاشمیری جیسے ہم جماعت، اس زمانے میں انہوں نے ادبی مضامین بھی لکھے جو رسالوں میں چھپتے رہے۔ 1940ء میں انہوں نے سکھوں اور مسلمانوں کی ایکتا پر ایک مضمون لکھا جو روزنامہ ''احسان'' لہور میں چھپا۔ یہ اس موضوع پر غالباً پہلا مضمون تھا۔

بی اے کرنے کے بعد 1942ء میں فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہوئی اور آفیسر ٹریننگ سکول سے ''گھٹنے کہنیاں چھلوا کر'' سولہ پنجاب رجمنٹ کے ساتھ برما کے محاذ پر چلے گئے۔ ڈاکٹر تاثیر اور فیض بھی فوج میں چلے گئے اور باقی رہ گئے تھے ظہیر کاشمیری۔

1944ء میں اسحاق محمد برما میں ہی میجر ہوئے اور اسی محاذ پر ملٹری کراس (برطانوی افواج کا دوسرا بڑا فوجی تمغہ) حاصل کیا۔ چھ ماہ کے لیے کمانڈر انچیف کے اے ڈی سی ہو کر کلکتہ بھی رہے۔ وہاں سے جاپانیوں کے خلاف لڑائی کے لیے ملایا بھیجے گئے۔ چھ اگست 1945ء کو امریکہ نے جاپان کے شہروں پر ایٹم بم پھینکے اور لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ ملایا سے واپسی پر انہیں صوبہ سرحد بھیجا گیا۔ جب پاکستان بنا تو وہ کوہاٹ میں تھے۔

1948ء میں کشمیر کے محاذ پر بھیجے گئے۔ کشمیر کی جنگ میں میجر جنرل اکبر بریگیڈ کمانڈر تھے اور

اسحاق محمد بریگیڈ میجر۔ 1950ء میں ریاست قلات میں رہے۔ 1951ء میں اور کئی فوجی افسروں کے ہمراہ راولپنڈی سازش کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے۔ الزام یہ لگایا گیا وہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ چار سال جیل میں رہے۔ جیل کا زمانہ حیدر آباد، لاہور اور منٹگمری (ساہیوال) میں گزارا۔

1955ء میں لاء کالج لاہور میں داخل ہوئے اور ساتھ ہی سیاست میں بھی، پہلے پہل عوامی لیگ میں شامل ہوئے جس کی قیادت حسین شہید سہروردی کے پاس تھی۔ جب نہر سویز پر حملہ ہوا تو سہروردی کی پالیسی سے اختلاف کے نتیجے میں مولانا بھاشانی اور دوسرے لیڈروں کے ساتھ مل کر نیشنل عوامی پارٹی بنائی۔

1957ء میں وکالت شروع کی۔ 1958ء میں مارشل لاء لگنے پر ایک دفعہ پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اس دفعہ الزام یہ تھا کہ کمیونسٹ ہیں۔ اس چھ ماہ قید کے دوران شاہی قلعہ لہور کے عقوبت خانے میں بھی رہے۔ 1960ء میں پھر سے گرفتاری مقدر ٹھہرا۔ اس بار بھی شاہی قلعے میں بھیجے گئے۔ اسی زمانے میں حسن ناصر بھی قلعے میں ہی تھے۔ رہائی کے بعد حسن ناصر کی زیرِ حراست موت بارے میجر صاحب نے سرکار کے ساتھ مقدمہ بھی لڑا۔ اس دوران آپ کو لاہور اور کراچی کے کامریڈوں کو جاننے کا موقعہ بھی ملا۔ بعد ازاں میجر صاحب نے اس مقدمہ کے حوالے سے ''حسن ناصر کی شہادت'' کے عنوان سے کتب بھی قلم بند کی جسے حال ہی میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ 1968ء میں نیپ کے دو ٹکڑے ہونے پر نیپ (مزدور کسان گروپ) کی بنیاد رکھی۔ 1970ء میں نیشنل عوامی پارٹی کا نام چھوڑ کر مزدور کسان پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1971ء میں یحییٰ خان دور میں گرفتار ہوئے اور فیصل آباد جیل میں رہے۔ اسی قید کے دوران ڈرامہ ''مصلی'' تخلیق کیا۔

مزدور کسان پارٹی نے 21 فروری 1971ء کو اپنے ملتان اجلاس میں میجر صاحب کو صدر چن لیا۔ 12 مئی 1973ء کو مزدور کسان پارٹی کی پہلی قومی کانگرس کے موقعہ پر انہیں مرکزی صدر چن لیا گیا۔

بھٹو کے دور میں بھی جیل گئے اور ضیاء الحق کے مارشل لاء میں بھی۔ آخری قید کے دوران پہلے فیصل آباد میں رہے پھر قید کی معیاد بڑھا کر انہیں بہاولپور جیل بھیج دیا گیا۔ وہیں انہیں فالج کا دورہ پڑا۔ اڑتالیس گھنٹے تاخیر کے بعد ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ دورانِ قید فیصل آباد ہسپتال لائے گئے۔

اس بیماری سے بہت حد تک اپنی بے مثال محنت سے صحت مند ہو رہے تھے۔ دھیرے دھیرے خود بخود چلنے پھرنے کے قابل ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ بیماری کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنی خداداد قوت مدافعت کی وجہ سے صحت مند بھی ہونے لگے۔ حتیٰ کہ دونوں ہاتھوں سے لکھنے بھی لگے۔ مگر موت نے ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔ یوں 2 اپریل 1982ء کو سہ پہر اڑھائی بجے دو دن کی مختصر علالت کے بعد فیصل آباد کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں فوت ہو گئے۔ 3 اپریل 1982ء کو چک 644 گ ب تحصیل جڑانوالہ ضلع فیصل آباد میں اپنی پیاری ماں جی کے پہلو میں دفنائے گئے۔

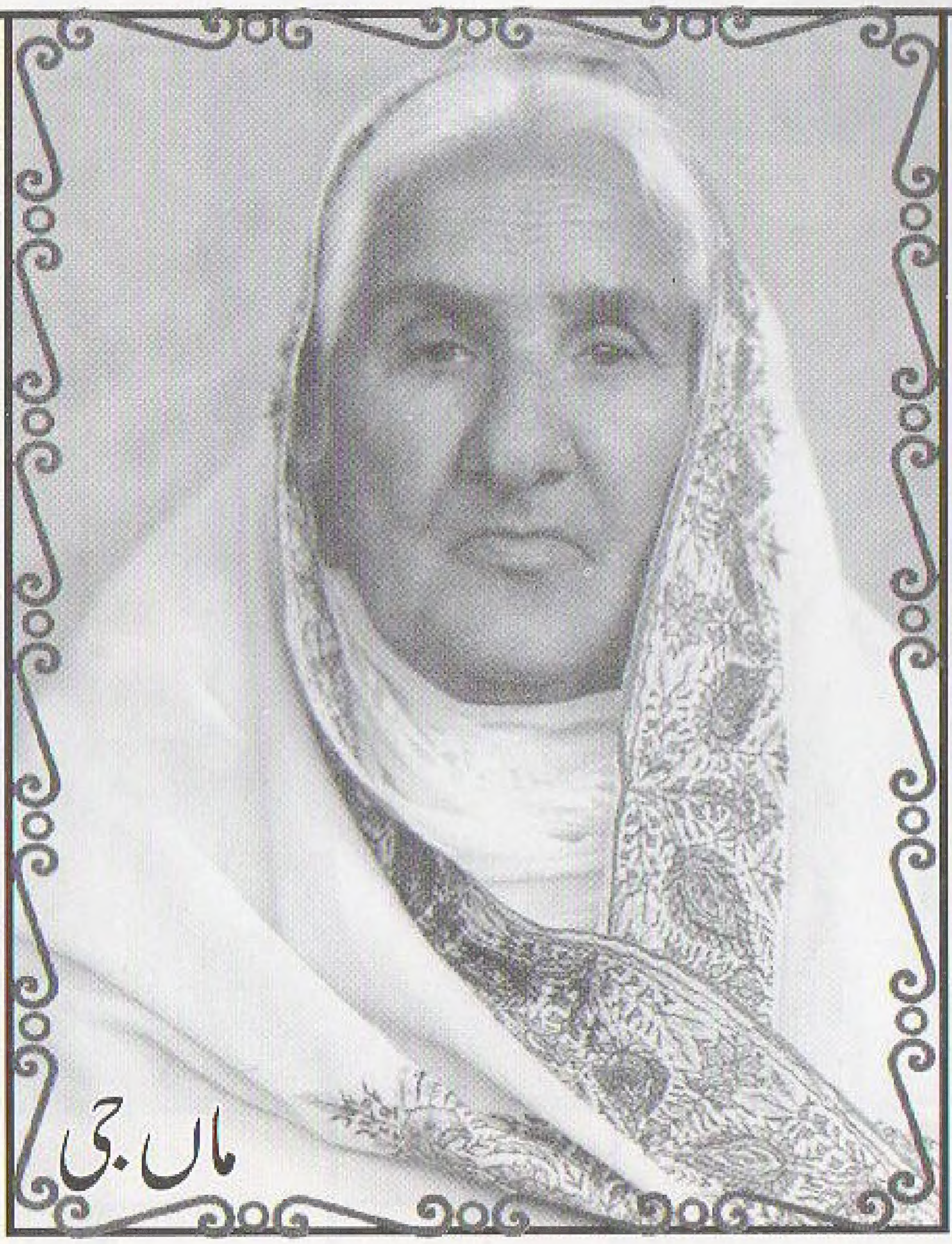

ماں جی

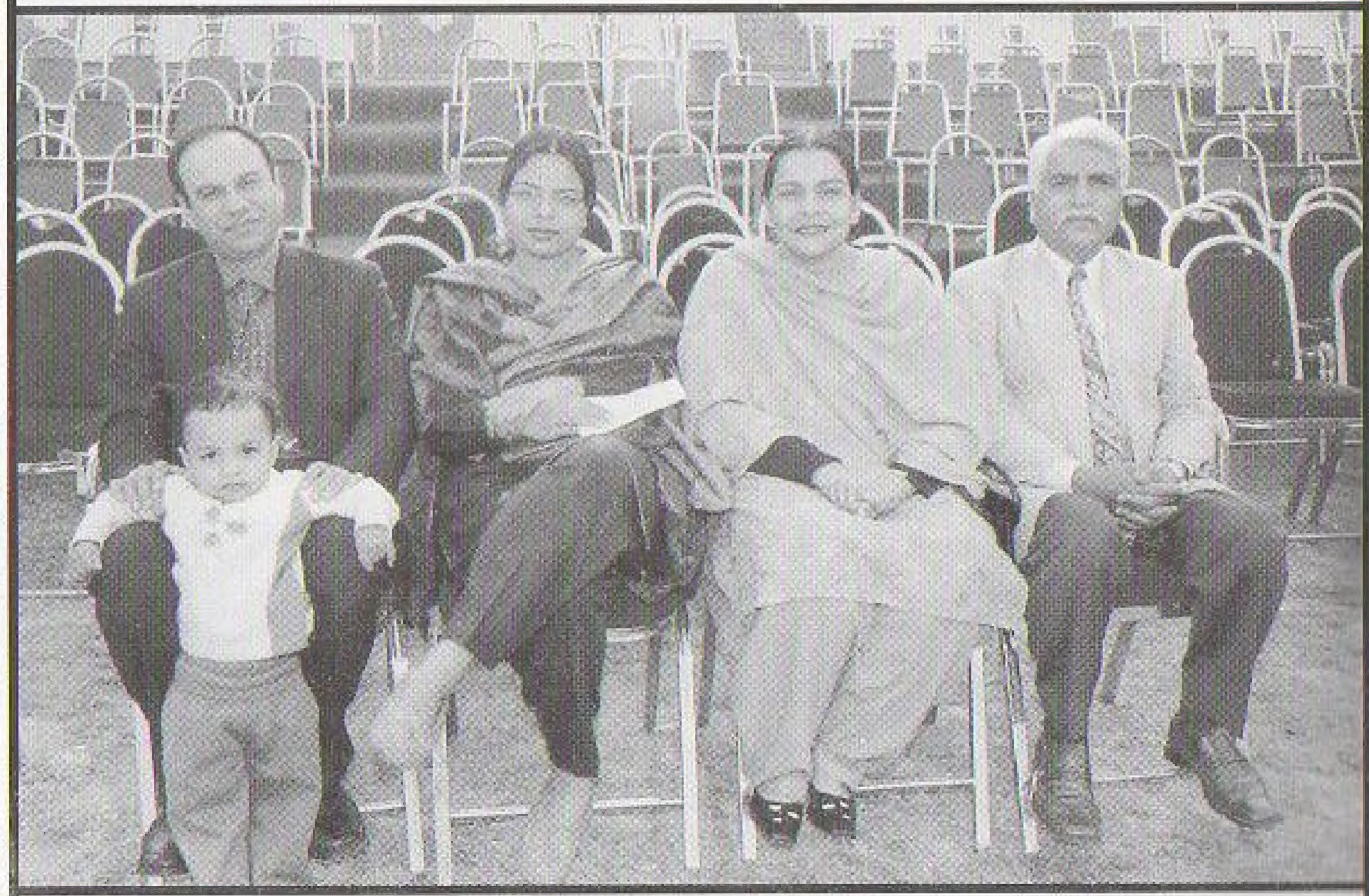

میجر اسحاق کے بیٹے میجر سلیم (انتہائی دائیں) اور اہل خانہ۔

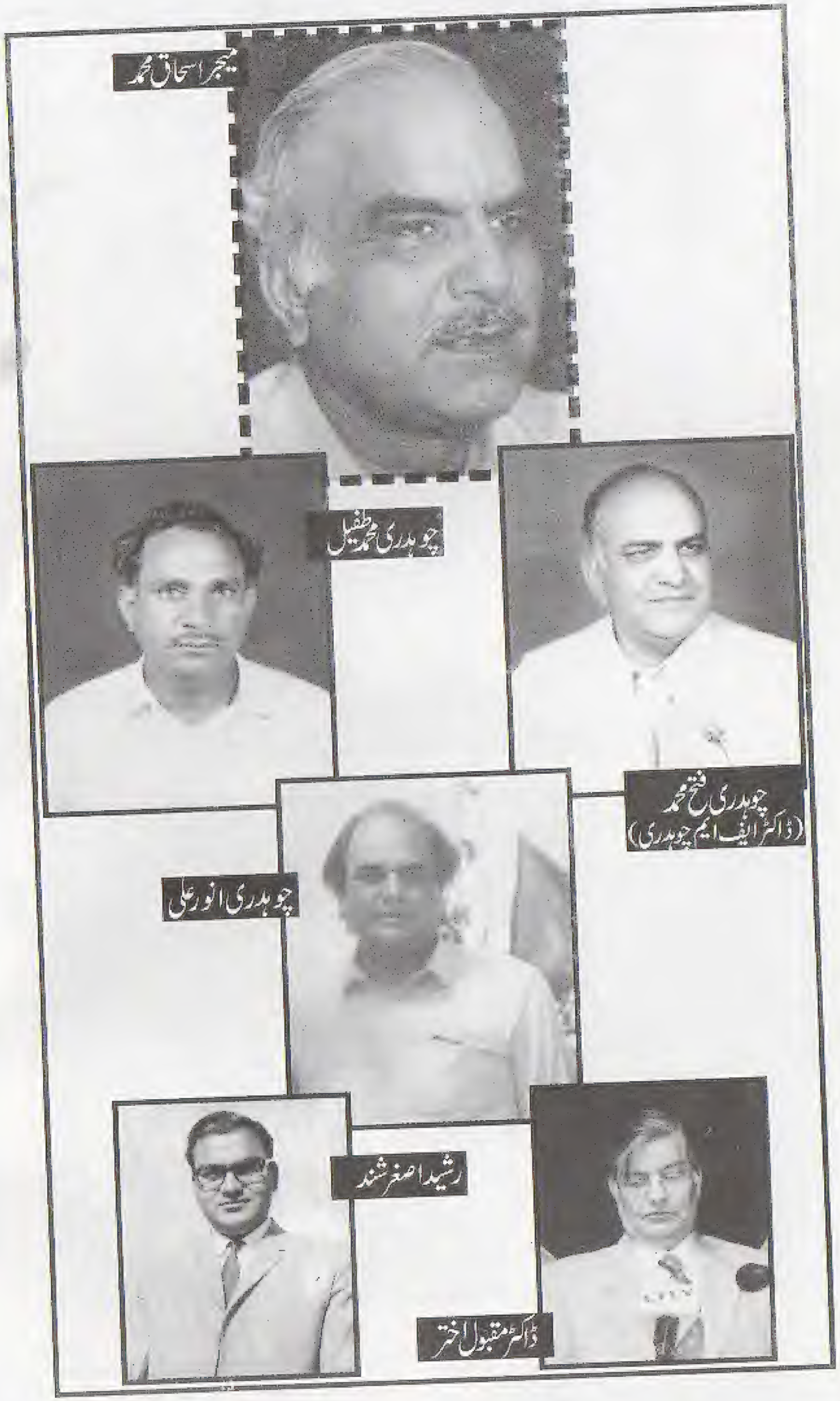
میجر اسحاق محمد
چوہدری محمد طفیل
چوہدری فتح محمد
(ڈاکٹر ایف ایم چوہدری)
چوہدری انور علی
رشید اصغر شند
ڈاکٹر مقبول اختر

باعث تحریر آنکہ...........

پیارے شَند!

تم نے مجھے کئی دفعہ فوجی زندگی کے بارے میں پوچھا ہے اور میں ٹال دیتا رہا ہوں۔ کبھی کبھار ایک آدھ واقعہ بیان کر دیا۔ کسی فوجی دوست کے بارے میں کچھ کہہ دیا یا کسی فوجی معاملہ پر رائے کا اظہار کر دیا۔ تم نے بھی کچھ ادب کی خاطر کچھ فوج کے بارے میں واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کبھی اصرار سے کام نہیں لیا۔ اس طرح میرے وسیلے سے فوج کے بارے میں بہت کم معلومات تمہارے پلے پڑی ہیں۔ نہ ہی مجھے کبھی اس موضوع پر کھل کر سوچنے کا بہانہ ملا ہے۔ اب جبکہ میرے تعلقات فوج سے ٹوٹ گئے ہیں اور مجھے فراغت بھی میسر ہے میں سمجھتا ہوں فوج کے بارے میں کچھ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

فوج کے بارے میں کیا کہوں؟ دنیا بھر میں اس موضوع پر سینکڑوں سالوں سے ہزار ہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ انگریزی زبان میں اس مسئلہ پر لائبریریاں بھری پڑی ہیں۔ اُردو میں البتہ بہت کم کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اس کی بڑی وجوہات دو ہیں۔ ایک یہ کہ قریباً سو سال سے نہ کوئی ملک اپنا رہا ہے نہ زبان اپنی رہی ہے۔ ہم اپنے ملک میں ہی غیر ملکی بنے رہے ہیں اور ہماری اپنی زبان سے ہمارے تعلقات منقطع رہے ہیں۔ چنانچہ باقی علوم کی طرح جنگ کا علم بھی اُردو کے احاطہ قدرت سے باہر رہا ہے۔ دوسری وجہ جو پہلی وجہ کا ہی ایک حصہ ہے یہ ہے کہ ان 98 سالوں (1849-1947) میں اپنے پاس کوئی فوج نہیں تھی۔ وہ فوج جسے انڈین آرمی کہا جاتا ہے سراسر انگریزی فوج تھی۔ انڈین اس لئے کہلاتی تھی کہ اس کو انگریز کے خزانے سے تنخواہ ملتی تھی۔ اس کا زیادہ حصہ ہندوستان میں مقیم رہتا تھا اور اس لئے کہ افسروں کے علاوہ باقی کے لوگ یہاں کے دیسی لوگ ہوتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم تک کوئی انڈین فوج میں ریگولر افسر نہیں بنایا گیا۔ اس کے بعد سیاسی دباؤ

میجر اسحاق اپنے ساتھیوں کے ساتھ

کی وجہ سے اِکا دُکا مقامی باشندوں کو فوج میں بطور با قاعدہ افسر کے لیا گیا۔ جنگ کے علم سے سپاہیوں کو بہت کم دخل ہوتا ہے اس لئے ان سے اس بارے کسی کتاب کی توقع رکھنا فضول ہے۔ سپاہی کا کام صرف حکم ماننا ہوتا ہے۔ جنگ کی پالیسی، طریقے، نئے ہتھیاروں کی ترویج، حالات کا اندازہ، یہ سب باتیں افسروں تک محدود رہتی ہیں (یا کم از کم برٹش انڈین فوج اور اس کی جانشین بھارتی اور پاکستانی افواج میں یہی حال رہا ہے)۔ چنانچہ اب جا کے کچھ پاکستانی افسر فوج سے علیحدہ ہو کر اس قابل ہوئے ہیں کہ اگر چاہیں تو اس بارے میں اُردو زبان میں کچھ لکھ سکیں۔ جہاں تک میرا علم کام کرتا ہے ایک دفعہ ایسا کیا بھی ہے۔ میں خود اُردو لکھنے میں دقت محسوس کر رہا ہوں۔ بہت عرصے سے صرف انگریزی پڑھنے اور لکھنے کا محاورہ ہے۔ اُردو محض اہلخانہ کے نام خطوں کے لئے مخصوص ہے۔ زیادہ تر یہ ہوتا رہا ہے کہ انگریزی میں سوچ کر اُردو میں اس کا ترجمہ کرتا جاتا ہوں۔

اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُردو ادب میں جنگ کے بارے میں کوئی مواد ہی نہیں۔ میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ ماڈرن جنگ کے بارے میں ذاتی تجربہ کی بنا پر یا بطور عالمانہ تنقید کے بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اُردو میں سینکڑوں کتابیں ایسی ہیں جن میں جنگ کا ذکر ہے۔ میں خود بچپن میں جنگِ صلیب و ہلال اور اسیرانِ مالٹا کے واقعات کے بارے میں منشی محمد صادق کے ناول بہت مزے لے لے کر پڑھتا رہا ہوں۔ پھر کسی پڑھے لکھے مسلمان نے رسول ﷺ کے غزوات، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور خالد بن ولید کے معرکوں کے بارے میں نہیں پڑھا۔ لیکن جس طریقے سے ان کو بیان کیا گیا ہے اس سے ایمان تو تازہ کیا جا سکتا ہے مگر جنگی حکمتِ عملی کے حوالے سے معلومات کم ہی ہیں۔ یہی حال سکندرِ اعظم، محمود غزنوی، علاؤالدین خلجی، بابر، نادر شاہ وغیرہ کی فتوحات کے تذکروں کا ہے۔ ان میں صرف ان لوگوں کی جرنیلی دکھائی گئی ہے۔ اس زمانے کی فوج کی تنظیم، بندوبست، ذرائع رسد و بار برداری، ہتھیاروں کی قسمیں اور اس کا استعمال نہیں دکھایا گیا۔ کمانڈروں کی ذہنی کوفت، ان کا تذبذب، کمزوری کے لمحات بارے ذکر کہیں نہیں ملتا۔ میں یہ کمی پوری کرنے کا دعویدار نہیں۔ ہاں، شاید مجھ سے اتنا بن آئے کہ آج کل کی لڑائی کے ایک حقیر سے کونے سے ذرا سا پردہ سرکا سکوں اور یہ واضح کر سکوں کہ جنگوں میں نعرہ تکبیر اور جوشِ ایمان کے علاوہ بھی کچھ باتیں ہوتی ہیں۔

فوج ہر اس نظامِ معاشرت کی خادم ہوتی ہے جس نے اسے قائم کیا ہو۔ یہ آخری حربہ ہوتی ہے جو ایک سوشل سسٹم کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک سسٹم کے قانون ساز ادارے وہ قانون تیار کرتے ہیں جو اس سسٹم کی بقا اور قیام کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ عدالتوں کا کام یہ ہوتا

ہے کہ اس قانون کا اجراء کریں اور دیکھیں کہ کوئی شخص اس قانون سے سرِ مو انحراف نہیں کرتا۔ ''انصاف'' کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ جب ایک قانون جاری ہو جائے تو اس پر سب کو بے رو رعایت عمل کرنے پر مجبور کیا جائے۔ عدالتوں کا کام یہ دیکھنا نہیں ہوتا کہ خود قانون میں انصاف کی گنجائش ہے یا نہیں۔ قانون ساز اداروں کی یہی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پولیس کا کام خلاف قانون کارروائیوں کا کھوج لگانا اور ان سے پیدا شدہ مقدمات پر عدالتوں کے احکام پر عمل کروانا ہوتا ہے۔ جب ان تین حربوں میں تعطل پیدا ہو جائے تو چوتھے حربے یعنی فوج کا کام ہوتا ہے کہ بروئے کار آئے اور سوشل سسٹم کو بربادی سے بچائے۔ ہمارے ملک میں مارشل لاء ایسی ہی حالت کا مظہر ہوتا ہے۔

انگریز کی انڈین فوج اس قانون سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ یہ آخری حربہ تھا جس کے استعمال سے انگریز اپنا اقتدار اس ملک پر قائم رکھنا چاہتا تھا۔ کس طریقے سے یہاں اقتدار رکھنا مقصود تھا یہ فیصلہ انگریز حکمران طبقہ کے نمائندے برٹش پارلیمنٹ میں کرتے تھے۔ یہ فیصلے قانون کی شکل میں ہندوستان پہنچتے تھے۔ یہاں کی عدالتیں اور پولیس ان پر عملدرآمد کرواتی تھیں۔ فوج ہر حکم بجا لانے کے لیے ہر دم تیار کھڑی رہتی تھی۔ جہاں کہیں شر پسند عناصر نے امن پسند رعایا کی روزمرہ زندگی اور کاروبار میں دخل اندازی کر کے سرکاری کام میں مداخلتِ بے جا کی وہیں چھاؤنی قائم کر دی گئی۔ فوج کو جہاں تک ممکن ہوا عام رعایا سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جنگی قبیلے اور ان کی جنگی روایات قائم کی گئیں۔ فوجیوں کو عام شہریوں پر برتری دے دی گئی۔ اگر فوج والوں کو اس ''برتری'' کا عادی نہ بنا دیا جاتا تو وہ کیونکر اپنے ملک والوں کے خلاف اور غیر ملکیوں کی برتری قائم رکھنے کے لیے لڑتے۔

ایسی فوج میں ایک کسان کے بیٹے کا کیا حصہ ہو سکتا ہے؟ وہی جو صدیوں سے کسانوں کے حصے میں آیا ہے یعنی سپاہی گری۔ اب تک ہمارے ملک کی تاریخ میں کسان کا سوشل فنکشن (Social Function) حاکمی نہیں محکومی رہا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کھیت، ہزاروں سال پرانے نمونے کے آلاتِ فلاحت، سورج، پانی، ہوا کی کارفرمائیوں کے سامنے اس کی بے بسی اور اس کے نتیجے میں اس کا خوف، ذہنی فلاکت اور اس کے دوسرے کسانوں کے خلاف چھوٹے چھوٹے حسد اور رقابتیں، اس کی کمینگی، جہالت اور تنگ نظری، جن سب کا وہ اپنے حالات کی وجہ سے شکار ہے، ان سب باتوں کے پیشِ نظر یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ صدیوں سے ہمارے ہاں کے کسان کے حصے میں صرف محکومی آئی ہے۔

میں ایک کسان کا بیٹا ہوں۔ چھوٹے بھائی کی طرح میرے لئے بھی انگریز کی فوج میں بطور سپاہی کے جگہ تھی۔ عام حالات میں میرا فوج میں افسر بن جانا ناممکن تھا۔ بطور افسر برٹش انڈین آرمی میں وہی لوگ افسر بنتے تھے جو بڑے حسب نسب کے مالک تھے۔ سرکاری دربار میں جن کا رسوخ تھا اور جن کی خاندانی خدمات تھیں۔ یعنی ہندوستانی معاشرت میں جن کی فضیلت انگریز کے اقتدار کے ساتھ وابستہ تھی۔ میں ''جس کے خاندان کو انگریزوں کی آمد سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا تھا اور جسے انگریزوں کے نہ آنے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا'' آخر کیوں انگریز کے اقتدار کو اپنے ہی ملک پر قائم رکھنے کے لئے اپنا دل دماغ اور جان لڑاتا؟ انگریز مجھے کس بناء پر اپنی فوج میں افسر بنا کر اپنی بقا کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈالتا؟ لیکن جنگ میں حالات بدل جانے سے قدریں تہ و بالا ہو جاتی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کا تقاضہ تھا کہ انگریز مجھے اور دوسرے سینکڑوں کسانوں کے بیٹوں کو اپنی فوج میں افسر لیتا۔

جنگ کا ایک اور تقاضہ یہ تھا کہ جنگ کا جیتنا دیگر تمام باتوں سے افضل ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اچھا لڑاکا تھا تو انگریز اُس کی اِس صفت کے مقابلہ میں اس کی تمام خرابیاں قربان کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ ان خرابیوں میں خاندانی شرافت کی کمی، سرکاری خدمات کی غیر موجودگی، اوضاع و اطوار میں انگریزی رکھ رکھاؤ سے بے بہری اور عام کھردرا پن شامل تھا۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ اگر جنگ کے پردے نے میرے سب غیر افسرانہ عیب وراثتی و ذاتی دونوں، نہ چھپائے ہوتے تو میرا فوج میں افسر بننا یا بنے رہنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ بات ذہن میں رکھی جائے تو میری بعض حیرت انگیز کرتوتیں حیرت انگیز نظر نہ آئیں گی۔ ان کو اگر کوئی عام حالات میں دہرانے کی کوشش کرے گا تو زک اُٹھائے گا۔

اس داستان میں مَیں بہت سی باتیں کہہ گیا ہوں۔ ان میں زیادہ تر وہ ہیں جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہے۔ اس سے بات تو پھیکی پڑتی ہے لیکن میں یک طرفہ کاروائی کے الزام سے بچ جاتا ہوں۔ بعض واقعات، تاریخیں اور جگہوں کے نام بھی گڑبڑ ہو گئے ہیں۔ میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ ایسا نہ ہو لیکن ڈائری کے نہ ہونے اور دوستوں سے مشورہ میں دشواریوں کی وجہ سے اس سے نجات ممکن نہیں ہے۔

پیار کے ساتھ

تمہارا ماموں

اسحاق محمد

باب نمبر 1

اک خاک نشیں، شہ نشین پر

''اوہو ہو ہو دیکھو چچا کو دیکھو'' نذیر نے شور مچا دیا۔ ''کیا ہے کیا ہے'' منیر نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں کو اور موٹا کرتے ہوئے کہا۔ وہ میرے پاس کھڑا تھا۔ لیکن اب کچھ دور چل کر اُسی جگہ سے میری طرف دیکھنے لگا جہاں سے نذیر دیکھ رہا تھا۔ ''چچا کو انڈے کھانے کا ڈھنگ نہیں ہے''۔ ''ہاہا'' اس کے بعد کوئی بات ہو گئی اور وہ دونوں ایک دوسرے پر باکسنگ اور کشتی کے ملے جلے داؤ چلانے لگے۔ میں جیسے بھی ہوا نیم اُبلے ہوئے انڈے کھاتا رہا۔

یہ 1942ء کا آغاز تھا میں بی۔ اے۔ کر چکا تھا۔ فوج میں کمیشن کے لیے منتخب ہو چکا تھا اور ٹریننگ کے لیے بنگلور جانے کی تیاری تھی۔ صوفی حمید علی صاحب بھی جو اُن دِنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں ڈائریکٹر فیزیکل ٹریننگ تھے، کمیشن کیلئے منتخب ہو چکے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی بیچ (Batch) میں تھے اور اکٹھے بنگلور پہنچنا تھا۔ اس لئے میں سفر کی تفصیلات طے کرنے کیلئے اُن کے ہاں لاہور حاضر ہوا تھا۔ بہت صبح چلا گیا تھا تا کہ اُن کو کالج جانے سے پہلے پکڑ سکوں۔ اُن کو جب پتہ چلا کہ میں نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا تو دو نیم اُبلے ہوئے انڈے اور چائے ٹوسٹ وغیرہ بھجوا دیئے۔

یہ نہیں، کہ میں نے اُبلے ہوئے انڈے پہلے کبھی کھائے نہیں تھے۔ ریل کے سفر میں کئی دفعہ اُبلے ہوئے انڈے کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ گھر میں بھی جس سال مرغیاں وبا کی نذر نہیں ہو جاتی تھیں کھانے کو انڈے مل جایا کرتے تھے، جو اُبلے بھی ہوتے تھے۔ اب کی یہ مشکل پیش آئی تھی کہ انڈے ہاف بوائل (یعنی ادھ پکے) تھے۔ ان کے ساتھ طشتری میں ایک ننھا منا اکڑوں سا پیالہ بھی تھا جس کا مصرف تو ایک طرف، مَیں اس کی شکل تک سے واقف نہیں تھا۔ پاس ہی تھوڑا سا نمک اور ایک چھوٹا چمچہ پڑا تھا۔ پہلے تو میں طشتری کو سامنے رکھ کر ان سب چیزوں کا جوڑ میل کرتا رہا۔ جب کوئی معقول حل نہ ملا تو باقی سامان چھوڑ کر انڈوں کی طرف متوجہ ہوا اور ایک انڈے کو اٹھا کر

طشتری کے کنارے سے ٹھوکر دے کر تھوڑا سا چھلکا اُتارا۔ آن کی آن میں اندر کا مواد نکل کر کچھ میری اُنگلیوں پر اور کچھ طشتری میں پھیل گیا۔ چمچے کا مصرف تو بجلی کی طرح میرے ذہن میں اُتر گیا اور میں نے ٹوٹے ہوئے انڈے پر نمک بُرور کر چمچے سے کھانا شروع کر دیا۔ البتہ پیالے کو کنکھیوں سے گھورتا رہا۔ یکا یک ہاتفِ غیب نے میرے کان میں کچھ کہا اور عرفان وایقان کے نور سے میری آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اتنے میں پہلا انڈا ابھی ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے دوسرا انڈا توڑا اور پوری تمکنت کے ساتھ جو ایسے موقعوں پر صرف ایک کسان کا ہی حصہ ہے اس کو پیالے میں انڈیلنا شروع کر دیا۔ عین اُس وقت نذیر نے شور مچا دیا۔

یہ واقعہ بیان کر کے مجھے اپنی ہنسی اڑانا مقصود نہیں ہے۔ ظاہر یہ کرنا چاہتا ہوں کہ سرکار انگلیشیہ کی فوج کی افسری کے پرشکوہ دروازے پر کس بے سروسامانی کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ ایک کسان کے بیٹے کو طشتری، ناشتے، پیالے، چمچے، ہاف بوائل انڈے اور تہذیب کے اسی قسم کے دوسرے لوازمات سے کم ہی واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن میں ذرا دیہاتی نہیں تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور چار سال شہر میں گزارے تھے۔ میری انگلیوں میں کم از کم اتنی پھرتی تو ہونی چاہیئے تھی کہ ایک بہتے ہوئے انڈے کو سمیٹ سکتا۔ دراصل شہر کی رہائش میں مَیں نے شہر کا اثر قبول نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انٹرمیڈیٹ کے دو سال میں اپنا کھانا خود پکایا کرتا تھا۔ پڑھائی کیلئے وقت بچانے کیلئے نہایت سادہ قسم کا کھانا پکانا ہی ممکن تھا اور گیلی لکڑیاں (سستی ہونے کی وجہ سے) اس سادگی میں اور اضافہ کر دیتی تھیں۔

بی۔ اے میں ایک تندور والے سے بندوبست کیا تھا اور تندور والے ناشتہ وغیرہ کے لوازمات کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے، چنانچہ اس ملک کے بلند ترین سوشل چبوترے پر چڑھتے وقت میں بالکل اَن گھڑت گنوار تھا۔ کئی سالوں کی مشق کے بعد اب اس قابل ہو گیا ہوں کہ عالی شان چبوترے پر بیٹھنے والوں میں شمار ہو سکوں۔ کبھی کبھی نظر چرا کر اس بے پناہ ہجوم کو دیکھ لیتا ہوں جو دھول مٹی میں لت پت اس عظیم الشان اور پُر فضا مسکن کی تعمیر و مرمت اور آرائش میں لگا ہوا ہے۔ میرے باپ دادا، پڑدادا بھی وہیں کہیں تھکے ماندے پڑے ہیں اور میں خداوندگان نعمت کی محفل میں جوتوں کی جگہ بیٹھا نہایت مستعدی سے ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کسی دل آرام کی اُچٹتی ہوئی نظر، تعریف کا ایک لفظ، لمحہ بھر کیلئے شہ نشین پر بٹھا دیتا ہے۔ لیکن ایک معمولی ٹھوکر اور......... بہت بڑا نشیب ہے!

حادثۂ بیضویہ کے چند ہی روز بعد میں صوفی حمید علی صاحب اور ایک دو اور ہمراہیوں کے ساتھ فرنٹیئر میل کے ایک فرسٹ کلاس ڈبے میں "صاحب بہادر" بنا ہوا بنگلور کی طرف رواں دواں تھا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں اس سے پہلے کبھی مجھے جھانکنے تک کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ جب کبھی ریلوے اسٹیشن پر گیا، خواہ مخواہ نظریں ان جگمگاتے ڈبوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ لیکن ان کی کھڑکیاں عموماً چڑھی ہوتی تھیں اس لئے اندر کی دنیا کا صحیح نقشہ جاننے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تخیل کی دنیا کو تو کوئی روک نہیں سکتا۔ ہم نے اپنے خیال میں یہ ڈبے پُر جلال صاحبوں اور پُر جمال میموں کی آماجگاہ بنا رکھے تھے۔ ایسا ہوا تھا کہ ہمارے دیکھنے میں کسی صاحب یا میم نے اپنے بیرے کو بلانے کیلئے کھڑکی کا شیشہ سرکانے کی زحمت گوارا کی تھی اور ہم نے ان افشاں وتاباں چہروں کا ایک لحہ کیلئے دیدار حاصل کر لیا تھا۔ ان کی شان وشوکت کا اندازہ ہم نے ان کے بیروں سے لگایا تھا۔ بیرے جو ہمارے ذیل دار سے بڑھ کر خوش پوش اور تھانے دار سے زیادہ پُر تمکین تھے۔

آج میں اسی ڈبے میں صاحب بنا بیٹھا تھا۔ یہ کالوں کا کالا صاحب! میرے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر سردار ہرنام سنگھ صاحب کہا کرتے تھے (وہ میرے سکول چھوڑنے کے بہت بعد آئے تھے لیکن مجھے اپنے شاگردوں کی طرح عزیز جانتے تھے) "بیٹا یہ ہٹلر کی مہربانی ہے اس نے یہ لڑائی صرف تمہارے لئے شروع کی ہے۔ میری طرف دیکھو ایم۔ اے کئے ہوئے پورے اٹھارہ سال ہو گئے ہیں دھیرے دھیرے 12,10 اور اب 15 کے گریڈ میں آیا ہوں، تم خوش قسمت ہو"۔ سردار ہرنام سنگھ نے یہ انکشاف بہت بعد میں کیا تھا جبکہ میں کمیشن لے چکا تھا اور چھٹی کے دنوں میں اُن سے ملنے گیا تھا۔ میرے ہمراہی آپس میں بات چیت میں مشغول تھے اور میں کھڑکی کی طرف منہ کئے اپنے ایک اور سفر کا واقعہ یاد کر رہا تھا۔ جون کا مہینہ تھا اور سال 1935ء۔ صرف چھ سات سال پہلے، میں نویں جماعت میں داخل ہو گیا تھا۔ آٹھویں کے یونیورسٹی امتحان میں اچھے نمبر آنے پر گورنمنٹ کی طرف سے مجھے وظیفہ ملنے کا اعلان ہو گیا تھا۔ لیکن وظیفہ چالو ہونے سے پہلے ایک سرٹیفکیٹ داخل کرانا تھا (جس پر کسی تحصیلدار یا نائب تحصیلدار صاحب کی تصدیق لازمی تھی) کہ میرے والد صاحب کی سالانہ آمدنی پانچ ہزار روپے سے کم یا اگر زمیندار ہیں تو سالانہ مالیہ پانچ سو روپے سے کم ہے۔ میں اور والد صاحب گاؤں کے پٹواری صاحب کو ساتھ لے کر جالندھر تحصیل ہیڈ کوارٹر میں پہنچے۔ وہاں پہنچنے کی تفصیلات مجھے یاد نہیں ہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ دفتر کھلنے سے پہلے ہی ہم وہاں حاضر تھے۔ سارا دن تحصیلدار اور نائب تحصیلدار کے دفتروں کے درمیان دھکے کھاتے

رہے مگر کہیں بھی رسائی نہ ہوئی۔ دوپہر کے وقفہ میں والد صاحب اور میں تحصیلدار کے دفتر کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ سہ پہر کو تحصیلدار صاحب آئے۔ ہم دونوں پر اُچٹتی سی نظر ڈالی اور چپڑاسی کو حکم دیا کہ ان کو بولو بینچ سے نیچے ہو کر بیٹھیں۔ والد صاحب تو شروع سے ہی اس بنچ پر بیٹھنے کو تیار نہ تھے صرف میرے اصرار پر بیٹھ گئے تھے۔ اب انہوں نے میری طرف ایک زخمی پرندے کی طرح دیکھا اور فرش پر اُتر آئے۔ بہت سبکی کے بعد ہمیں مطلوبہ سرٹیفکیٹ مل گیا اور ہم گھر کی طرف چلے۔

والد صاحب نے حقے کا ایک نیچہ خریدنا تھا۔ وہ خرید کر ہم کچھ دیر بعد کرتار پور کے تانگوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ اس دن کرتار پور میں آماوس کا میلہ تھا۔ سب تانگے وہاں گئے ہوئے تھے۔ تانگے والوں نے کافی پیسے کما لیئے تھے اس لئے واپس کرتار پور جانے کو تیار نہیں تھے۔ بہت تگ ودو کے بعد ایک تانگے والا ملا جو کرتار پور سے سواریوں کا ایک اور پھیرا کرنا چاہتا تھا اور جلدی میں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ کرایہ طے نہیں ہو رہا تھا۔ والد صاحب چھ پیسے سواری کی بجائے پانچ پیسے دینے کو تیار تھے۔ اتنے میں ایک اور تانگے والے نے للکارا ''کرتار پور پانچ پیسے سواری'' ہم اُدھر لپکے لیکن ہمارے وہاں پہنچتے پہنچتے وہ سواریوں سے بھر گیا۔ مڑ کے دیکھا تو پہلا تانگے والا جا چکا تھا۔ ہم بہت دیر اس اڈے پر خراب ہوتے رہے لیکن کوئی تانگہ نہ ملا۔ اب وہ سفر شروع ہوا جسے میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھا ہوا یاد کر رہا تھا۔ گرمی زوروں پر تھی اور ہم چاہتے تھے کہ راتوں رات گھر پہنچ جائیں تا کہ دن کے سفر میں شدت کی دھوپ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کرتار پور تک اگر تانگہ مل جاتا تو اگلے پانچ سات میل کچھ اتنے مشکل نہ تھے مگر تانگہ نہ ملا۔ جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی، اول تو تانگے ملتے نہیں تھے اور اگر ملتے بھی تھے تو اُن کا کرایہ بڑھ گیا تھا۔ والد صاحب اب اس پر تیار ہو گئے تھے کہ تانگے والے چھ پیسے سواری لے لیں۔ وہی جو شام کے وقت تانگے والا مانگ رہا تھا۔ لیکن تانگے والے دو آنے سے کم پر نہیں مان رہے تھے۔ آخر ہم نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا اور چل پڑے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد میں نے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لئے۔ اب مشکل یہ تھی کہ سڑک کا گولہ اتنا تپا ہوا تھا کہ ننگے پاؤں اس پر چلنا ممکن نہیں تھا۔ سڑک کے کناروں پر نرم دھول تھی لیکن اس میں پتھر اور کنکر ملے ہوئے تھے، جو تلوؤں میں چبھتے تھے۔ جوتے اس قابل نہیں تھے کہ اُن سے جوتوں کا کام لیا جاتا بہر حال کچھ دیر کے بعد میں نے ''سو جوتے اور سو پیاز'' قسم کا فارمولا نکال لیا اور کبھی پکے پر چلنے لگا اور کبھی کچے میں۔

دنیا اپنا اپنا کاروبار ختم کر کے اپنے اپنے رین بسیروں کی طرف رجوع کر رہی تھی۔ شہر کے لالے

میر سے واپس آ رہے تھے۔ گاڑی بانوں نے شہر سے باہر اپنے گڈے روک لیئے تھے تا کہ صبح ہونے پر منڈیوں میں اپنا سامان پہنچا سکیں۔ کچھ کھانا پکا رہے تھے اور کچھ لیٹ گئے تھے۔ اُن کے بیل اپنی تھکاوٹ دور کرنے کیلئے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے اور اُونگھ رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بیل سر ہلا کر اپنی ٹلیاں کھڑکا دیتا تھا۔ اس سے امن اور آرام کی آوازیں صبا کے جھونکے کی طرح لہرا اٹھتیں تھیں۔ میں چل رہا تھا۔ نیند اور راحت کا شدید احساس جو مجھے اس وقت ہو رہا تھا اس میں بھی ایک طرح کا خمار تھا۔ ایک طرف سخت جسمانی اور ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔ سارا دن عدالت میں دھکے کھانے اور تانگے والوں سے تکرار کے بعد تھکاوٹ سے چکنا چور تھا اور تپتی ہوئی گرد آلود سڑک پر چل رہا تھا۔ دوسری طرف گھر یاد آ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ رات کے جس حصے میں بھی ہم گھر پہنچے میری ماں اُٹھ کر میرے سرہانے آ بیٹھیں گی اور حسب معمول تھپکتی اور دم درود کرتی رہیں گی۔ حتیٰ کہ میں میٹھی نیند سو جاؤں گا۔ اس طرح حال کی کوفت نے مستقبل کی راحت کے خیال کو اور بھی خوشگوار بنا دیا تھا۔ سڑک کے پکے گولے پر تانگے کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں بہت دور سے کانوں میں آنی شروع ہو جاتیں تھیں اور ان آوازوں کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں بیم و رجا کی کشمکش تیز ہوتی جاتی تھیں۔ جب تانگے پاس سے گزر جاتے تھے تو ٹاپوں کی آوازیں مرتے مرتے بہت دیر میں مرتی تھیں۔ مجھے ایسا لگتا کہ یہ ٹاپوں کی آوازیں نہیں بلکہ میری دم توڑتی ہوئی حسرتوں کی نبض کی آواز ہے جو آہستہ آہستہ مدہم ہوتے ہوتے دم توڑ رہی ہے۔

مجھے اپنے بوڑھے باپ پر بھی ترس آ رہا تھا۔ وہ غریب تھا لیکن اپنے گاؤں میں چوہدری گنا جاتا تھا۔ آج صبح سے اپنے بیٹے کی موجودگی میں تحصیل کے چپڑاسیوں اور تانگے والوں کے ہاتھوں کئی دفعہ سنگسار ہو چکا تھا۔ والد صاحب ہر تانگے والے کو آواز دیتے تھے۔ یہ تانگے والے وہی تھے جن کے ساتھ ہم اڈے پر تکرار کر چکے تھے اور باوجود ہمارے اتنا چل چکنے کے وہ اب بھی دو آنے سے کم پر تیار نہیں تھے۔ ریل کے پھاٹک تک جو جالندھر اور کرتار پور کے درمیان تقریباً نصف فاصلے پر ہے ہم تانگے والوں کے پیچھے پڑے رہے اس کے بعد ان کا خیال چھوڑ دیا۔ اب میرے ذہن پر گھر کا میٹھا ماحول بالکل چھا گیا اور میں کسی اور ہی دنیا میں جا بسا۔ کرتار پور کے بازار میں پہنچے تو یکا یک چونک اٹھا اور دھم سے اس دنیا میں واپس پہنچ گیا۔ وہاں سے نکل کر ہم راستہ بھول گئے۔ میرے والد بیسیوں دفعہ کرتار پور آ چکے تھے لیکن ہمیشہ دن میں۔ اب رات کے وقت ساری کائنات بدلی ہوئی تھی۔ وہ قدم قدم پر رک جاتے تھے لیکن راستہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔ رات سخت

کالی تھی۔ پھرتے پھراتے ہم پہلے تو پوہلیوں کے ایک کھیت میں پھنس گئے اور اس کے بعد خربوزوں کے ایک اجڑے ہوئے کھیت میں داخل ہو گئے لیکن ایک دو خربوزے جو ملے سڑے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی آموں کے چند پیڑ تھے۔ رکھوالے نے ہمیں بتایا کہ ہم راستے سے کوئی پون (3/4) میل مغرب کو نکل آئے ہیں۔ والد صاحب کو بھی اپنی غلطی سمجھ میں آ گئی۔ جی نے چاہا کہ چل پڑیں لیکن پوہلیوں سے ڈر گئے۔ وہیں ایک درخت کے نیچے جگہ بنا کر سو رہے۔

ریل کے ڈبے میں مجھے کشف سا ہوا کہ انگریز نے جو مجھے گوبر کے ڈھیر سے اٹھا کر تختِ شاہی کے جلو میں لا کھڑا کیا ہے تو اس میں نہ میری لیاقت کو دخل ہے نہ اس کی شرافت کو۔ اگر ہٹلر کی مہربانی نہ ہوتی تو شاید انگریز کے کلرکوں کا کلرک بھی نہ بن پاتا۔ اس سے نتیجہ میں نے یہ نکالا کہ انگریز کی مجبوری کو اس کا احسان مت سمجھو اور اس حد تک اکڑے رہو جس حد تک انگریز کا غصہ اس کی ضرورت سے تجاوز نہ کر جائے۔ میں نے سوچ لیا کہ گورا ناراض بھی ہو گیا تو زیادہ سے زیادہ فوج سے نکال دے گا۔ ایک غیر ملکی حکومت کے مردہ افسر کی نسبت زندہ کسان بہر حال بہتر ہے۔

بنگلور پہنچتے پہنچتے صوفی حمید علی صاحب نے یورپین رکھ رکھاؤ کے بہت سے طریقے سکھا دیئے۔ زیادہ ضرورت آدابِ طعام سیکھنے کی تھی۔ اس مقصد کیلئے دو تین دن کے سفر میں ہم نے ہمیشہ انگریزی کھانے کا آرڈر دیا۔ اس کی وجہ سے چھری کانٹوں کے استعمال کے موٹے موٹے اصول سمجھ میں آ گئے۔ باقی باتیں وہی تھیں جن کا مقصد ساتھ والوں کی دل آزاری سے اجتناب ہوتا ہے۔ مثلاً کھاتے وقت چپک چپک کی آواز پیدا نہ ہو۔ لقمہ چھوٹا ہو۔ باچھوں سے شوربا نہ ٹپکے۔ اپنی اپنی پلیٹ میں کھانا، اتنا ہی لیا جائے جتنا کھا لینا ہو۔ کھاتے وقت آدمی ساتھ والوں کا بھی خیال رکھے۔ بھینس کی طرح اپنی پلیٹ میں ہی غرق نہ ہو جائے۔ ڈکار کو کسی اور وقت پر رکھ چھوڑے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ممبئی میں وقت مل گیا اور صوفی حمید علی صاحب نے 12 روپے یا 8 روپے میں ایک گھڑی مجھے لے دی۔ ایک خاصی اچھی فلٹ ہیٹ 6 روپے میں مل گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہیٹ عرصہ سے دوکاندار کے پاس پڑی تھی۔ اب تک اسے کوئی مناسب سَر دستیاب نہیں ہوا تھا۔ جب اس نے میرے سَر کو دیکھا تو ایسا تسکین کا سانس لیا کہ گویا کسی مرض سے نجات پا لی ہے۔ میرے خیال میں وہ ہیٹ اتنے عرصے سے اس کی نظروں میں کھٹک رہی تھی کہ اب اس کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ جب دیکھا کہ میرے سَر پر فٹ ہے تو بالکل مفت دینے پر تیار ہو گیا پھر سنبھلا اور 6 روپے وصول کر لیئے۔

باب نمبر 2

عزرائیل کی شاگردی میں

سو ہم بنگلور پہنچ گئے۔ پہلی درخواست اور فائنل انتخاب میں چھ مہینے لگے تھے۔ جب تک آخری انتخاب نہیں ہو گیا میں بیم و رجا کی حالت میں تھا۔ خیال تھا نہ میرے پاس خدمت سرکار کی سند ہے اور ہی نہ میرا باپ امیر ہے۔ جب میرے پاس کوئی سیاسی سفارش ہی نہیں ہے تو انگریز کو کیا پڑی کہ اتنی اچھی نوکری مجھے دے۔ کمشنری میں جب پہلے انٹرویو کیلئے گیا تو دیکھا کہ دوسرے لڑکوں کے پاس سند کلاس اوّل، سند کلاس دوم اور دوسری سفارشی چٹھیوں کے پلندے کے پلندے تھے اور لحیم و شحیم سفید پوش ساتھ تھے۔ میں یکہ و تنہا اس جمِ غفیر میں ایک یتیم کی طرح پھر رہا تھا۔

انٹرویو کیلئے بلاوے کے انتظار میں تھا کہ کمشنر کے دفتر کا ایک کلرک میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں سرکاری فارم پر لکھی ہوئی میری درخواست تھی۔ پوچھا یہ آپ کی درخواست ہے، میں نے کہا ہاں۔ بولا اس پانچ کے ہندسے کو ایک سو پچاس بنا دو۔ میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بولا ہرج ہی کیا ہے۔ آج کل غریب کو کوئی نہیں پوچھتا! اس معمولی ہیر پھیر سے کامیابی یقینی ہو جائے گی۔ اچھا ایک صفر ہی بڑھا دو۔ میں نے کہا میں نے پہلے ہی چار روپے بارہ آنے کے پانچ روپے کر دیئے ہیں۔ اب پانچ کے پچاس کیسے کر دوں۔ کوئی وقت تھا جب میرا باپ زیادہ مالیہ دیا کرتا تھا لیکن آج کل تو چار روپے بارہ آنے ہی ہیں۔ بولا اچھا اس دوسرے سوال میں "نہ" کی جگہ "ہاں" کر دو۔ میں نے کہا جناب والا بات یہ ہے کہ اگر کمیشن نہ ملا تو میں بطور سپاہی کام کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ تو سودا ہے انگریز کو منظور ہوگا تو کریگا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں میری ہمدردی میں اور میری بے وقوفی پر غمناک تھیں اور اس کا ماتھا افتخار سے چمک رہا تھا۔ اس شخص کو نہ میں پہلے سے جانتا تھا نہ بعد میں ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن جب میں اس کا مقابلہ اس سکھ تحصیلدار اور ہندو نائب تحصیلدار سے کرتا ہوں جو پٹواری کی گواہی کے

باوجود سرٹیفکیٹ دینے کو تیار نہ تھے تو پاکستان میری نظر میں معجزہ نہیں رہتا۔ تنگ نظری وقتی طور پر شاید مفید رہتی ہو لیکن اس سے دلوں میں جو ناسور پیدا ہو جاتے ہیں وہ قوم بھر کے جسم و جان کو زہر سے بھر دیتے ہیں۔ ایک دکھا ہوا دل اس آگ کی مانند ہوتا ہے جس سے ہزاروں دوسری آگیں جل اٹھتی ہیں۔

بنگلور پہنچ کر مجھے تکلیف ہونے لگی کہ میں فوج میں کیوں آیا۔ کسانوں کے بیٹے صدیوں سے فوج میں بھرتی ہوتے رہے ہیں۔ بلکہ کہنا چاہئے گھسیٹ لیے جاتے رہے ہیں۔ یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ میرا اپنا چھوٹا بھائی دو سال ہو چکے تھے غریبی کی الجھنوں سے تنگ آ کر فوج میں بھرتی ہو چکا تھا اور ملایا میں جاپانیوں کی قید میں تھا۔ میں نے آئن سٹائن کا یہ مقولہ ابھی تک نہیں پڑھا تھا "جب میں ایک انسان کو زرق برق لباس میں ایک بینڈ کے پیچھے اکڑ اکڑ کر چلتے دیکھتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے کہ ایک انسانی ذہن کی توہین ہو رہی ہے اس شخص کیلئے تو بہتر تھا کہ وہ گدھا ہوتا" اسی قسم کے دوسرے وسوسے میرے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے اور میں خوش نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ انگریزوں کے چہروں پر ایک طرح کا نور اور طمانیت تھی۔ وہ لوگ کسی آدرش کی خاطر لڑ رہے تھے۔ وہ اپنے ملک کو غیروں کی غلامی سے بچانے کیلئے لڑ رہے تھے۔ وہ فسطائی ظالموں کو نیچا دکھانے کیلئے لڑ رہے تھے۔ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کیلئے لڑ رہے تھے۔ وہ اپنے ملک کی عظمت کو برقرار رکھنے کیلئے لڑ رہے تھے۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کی میراث کیلئے لڑ رہے تھے۔ سب انگریز ان تمام باتوں پر متفق نہ بھی ہوں (مثلاً جنگ کے بعد انتخابات میں چرچل کی شکست سے ظاہر ہوا کہ ان کے اپنے ملک کے جابروں اور مجبوروں میں بھی کشمکش تھی) لیکن ہر ایک انگریز کیلئے ان سب باتوں میں سے ایک آدھ ضرور ایسی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ سے عظیم تر سمجھتا تھا اور جس کی خاطر اسے جان دینے میں باک نہیں تھا۔ اس کے برعکس ہر ایک ہندوستانی کے ماتھے پر کالک سے "پیٹ" لکھا ہوا تھا۔ ہم لوگ کس لئے لڑ رہے تھے؟ پیٹ کی خاطر۔ شاید ہم میں ایسے بھی ہوں جو انسانیت کو فسطائی چنگل سے نجات دلانے کے لئے فوج میں آئے تھے۔ لیکن بنگلور میں مجھے کسی ایسے شخص سے واسطہ نہیں پڑا۔ بلاشبہ میرے ساتھیوں میں بہت سے ایسے تھے جو سرو قد تھے خوددار تھے۔ صاحبِ دل اور صاحبِ دماغ تھے۔ جو نوجوانانِ عالم کے کسی اجتماع میں بھی اپنی انسانی خوبیوں کے طفیل شریک ہونے کے قابل تھے۔ لیکن افسوس کہ جس قدر ذاتی خوبیوں کی بناء پر ان کی جبینیں تاباں و تابندہ تھیں، ان کے ماتھے پر "پیٹ" کی

کالک اتنی ہی گھناؤنی تھی۔ مجھے کوئی بھی ایسا نظر نہ آیا جو "چنگیز خاں" ہو یعنی جو انسانی خون کی مٹی پلید کرنے میں انسانی عظمت کا راز مضمر جانتا ہو۔

آخر انسان کشی کا پیشہ اختیار کرنے کیلئے کوئی جواز تو ہو۔ میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ انگریز نے ٹریننگ اس ڈھنگ کی رکھی تھی کہ میری ذہنی تکرار واضح ہو گئی تھی۔ اس ٹریننگ میں کسی قسم کی جذباتیت تھی نہ رومان۔ شکار کیلئے چیتوں کی تربیت کی جا رہی تھی۔ لڑائی بھڑائی کے متعلق ہم نے عجیب عجیب خیالات پرانے وقتوں کے قصے کہانیوں سے اخذ کر رکھے تھے۔ مثلاً فوج کا افسر نہایت ہٹا کٹا موٹا تازہ ہوتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں ہوتی ہیں جن سے خون ٹپکتا ہے۔ جب وہ ملازم سے پینے کا پانی بھی مانگتا ہے تو پہلے وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے پھر ملازم کی طرف ایک نگاہ غلط انداز پھینکتا ہے اور غرّاتا ہے۔ "پانی"۔ ٹریننگ کے بارے میں تو کبھی سنا تک نہیں تھا۔ بس مرد مجاہد میدان میں اترتا تھا۔ گھوڑے کو ادھر ادھر دوڑاتا پھراتا تھا اور دشمن کی صفوں کی طرف دیکھ کر گرجتا تھا "او ملعون کفار کوئی ہے تو سامنے آئے" اور ہمیشہ یہی ہوا کہ مردِ مومن نے اپنے مدِ مقابل کو آنکھ جھپکتے میں ہی کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ مسلمان کافروں کے ساتھ تو آغازِ اسلام کے چند سال ہی لڑے ہیں۔ اس کے بعد اب تک زیادہ تر آپس میں ہی بھڑتے رہے ہیں۔ لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ جب مسلمان، مسلمان کو قتل کرتا تھا تو کس قسم کا رجز پڑھتا تھا۔ مثلاً جب نادر شاہ کے سپاہی دِلّی میں قتلِ عام کر رہے تھے تو کون سا نعرہ بلند کر رہے تھے یا جب تیمور لنگ نے مسلمان دشمن کے ایک لاکھ سپاہیوں کو دِلّی کے باہر قتل کیا تو کون سا رجز پڑھا۔

بہر حال بنگلور آنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ مردِ مجاہد کیلئے صرف اتنی ٹریننگ کی ضرورت تھی کہ گلا پھاڑ کر نعرہ تکبیر بلند کرے اور دشمن کی صفوں میں گھس کر کشتوں کے پشتے لگا دے۔ ہم سمجھتے تھے انگریزوں نے اس کی کوئی "فرنگی" صورت اختیار کر لی ہو گی۔

مگر جو دیکھا تو یہاں کا باوا آدم ہی نرالا تھا۔ ہماری کمپنی میں کوئی ایک سو بیس کے قریب زیرِ تربیت افراد ہوں گے۔ ان میں زیادہ تر میرے جیسے کالجوں کے لڑکے تھے۔ بعض تو بالکل نوخیز معلوم ہوتے تھے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ بڑی مونچھوں والے قوی ہیکل تند و تیز "سپہ سالاروں" کے سلسلے کی کڑی ہیں۔ اگر خود انگریز بھی مہذب صورت نہ ہوتے تو میں سمجھتا یورپ اور مشرقِ بعید کی پے در پے شکستوں کے بعد ان کا دماغ چل گیا ہے جو اس قسم کے ہندوستانی افسری کے لیے بھرتی کر لئے ہیں۔

ایک طرفہ تماشا تھا۔ لباس کیا تھا؟ بڑے بڑے بے ڈھنگے سے بوٹ، جن کی گھوڑوں کی طرح نعل بندی کی ہوتی تھی۔ موٹی موٹی خاکی جرابیں، خاکی نیکر، قمیض اور سروں پر بڑا سا خاکی ٹوپ صبح سے شام تک۔ کبھی پی ٹی کرنا تو کبھی گھٹنوں کے بل چلنا۔ کبھی کہنیوں پر رینگنا، کبھی پہاڑیوں پر چڑھنا اور کبھی بدرروؤں میں پناہ لینا۔ غرض ہم پر باقاعدہ چابک سواری ہو رہی تھی۔ دن بھر گھوڑا گدھا ایک کرنے کے بعد شام کو البتہ کافی خاطر مدارت ہوتی تھی۔ پہننے کو کوٹ پتلون ٹائی، نہانے کو گرم پانی، خدمت کو ایک نوکر، کھانے کو دودھ، مکھن، پنیر، گوشت، مچھلی، فروٹ، جتنا کوئی کھا سکے۔ مجھے اور دوسرے بہت سوں کو پہلی دفعہ دن میں پانچ مرتبہ کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ''چھوٹا حاضری'' ناشتہ، لنچ، چائے اور ڈنر۔ تھوڑے ہی دنوں میں طباشیر رنگ بابو تانبے کی طرح چمکتے دمکتے جوان بن گئے۔

ذہنی تربیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہفتے میں چند پیریڈ انگریزی زبان، فوجی قانون، فوجی بندوبست کے ہوتے تھے اور اللہ اللہ خیر سلا۔ شروع شروع میں سیاست کا ایک پیریڈ بھی پروگرام میں شامل تھا لیکن پہلے ہی دن ہم میں سے ایک صاحب نے انگریزی راج کی برکتوں پر تقریر جھاڑ دی۔ ہم لوگوں نے شور مچا دیا۔ انگریز کی فراست کے آفرین، مسکرا دیا اور مقرر کو چپ ہو جانے کو کہا۔ دل میں کہہ رہا ہوگا۔ ''بیٹا جنگ نہ چھڑتی تو تم میرے پاس کلرکی کے لیے آتے اور انگریز ہی نہیں اس کے باپ دادا کی برکتوں کی گردان پڑھتے۔ میں تمہیں بوٹ کی ٹھوکر مار کر دفتر سے نکال دیتا اور تم میں سے ایک دو شاید ہمارے خلاف نعرے لگا کر جیل چلے جاتے۔ لیکن زیادہ تر کسی دوسرے دفتر کی راہ لیتے، کسی اور انگریز کے بوٹ کی ٹھوکر کا مزہ چکھتے۔ کتے کے پلو! تم مانو نہ مانو میں تم سے انسانی شکار کا کام لوں گا''۔ اور ہم بظاہر تو ''برکتوں'' والے کو پنجابی میں مغلظ گالیاں دے رہے تھے لیکن دل میں رو رہے تھے کہ پہلے ہی ہمارے سینے اپنی بے عزتی پر چاک چاک ہیں اور یہ شخص جان بوجھ کر نمک چھڑک رہا ہے۔ بہرحال اس کے بعد ہماری کلاس میں سیاسیات پر کبھی بحث نہ ہوئی۔ میرے خیال میں طرفین نے سمجھ لیا تھا کہ سیدھے سادے سودے پر ''نظریات'' کا خول چڑھانا فضول ہے۔

چھ مہینے کی ٹریننگ میں پہلے چند مہینے میری حالت بہت زار رہی۔ ایک تو ذہنی کوفت تھی جو فوج کے ڈسپلن سے ہوتی تھی۔ پہلے ہی دن انگریز سارجنٹ نے ہمیں ''اٹن شن'' ہونے کو کہا تو مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ ایک انگریز سارجنٹ کے حکم پر دس درجن پڑھے لکھے ہندوستانی نوجوان یوں دم سادھ کر کھڑے ہو گئے گویا اکڑے ہوئے مُردوں کو پاؤں پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ایک دو لمحے تو میرا ذہن ماؤف رہا۔ اس کے بعد سارجنٹ صاحب کو جھٹلانے کیلئے میں نے ہاتھ کے انگوٹھوں کو باری باری

ہلانا شروع کر دیا۔ (ظاہر ہے کہ جس سمت کو انگریز ہوتا تھا اس سے دوسری سمت کا انگوٹھا ہلتا تھا) جب ہاتھ کے انگوٹھے ہلانے میں مصلحت نہیں دیکھتا تھا تو بوٹ کے اندر پاؤں کا انگوٹھا ہلا لیتا تھا۔

ایک اور تکلیف وقت کی کڑی پابندی تھی۔ دیہاتیوں کے سال بھر کے صرف تین چار حصے ہوتے ہیں۔ یہاں ایک ایک منٹ گنا جاتا تھا۔ پھر میں صبح اٹھنے کے بارے میں بہت کمزور واقع ہوا ہوں۔ کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ باپ دادا کی ساری تھکاوٹ مجھ میں عود کر آئی ہے۔ بچپن میں والد مسجد کو جاتے وقت والدہ سے کہہ جایا کرتے تھے کہ اس کو جگا کر نماز کیلئے بھیج دینا۔ باوجودیکہ ان کا مجھ پر بہت دبدبہ تھا اور والدہ کا اصرار بھی پیارا پیارا لیکن مسلسل ہوتا تھا مگر میں ہمیشہ اٹھتے اٹھتے دن کر دیا کرتا تھا۔ سکول اور کالج میں استاد عموماً مجھ پر مہربان رہے اس لئے گزارہ ہو ہی جاتا تھا۔ لیکن یہاں ایک منٹ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجنے میں پانچ منٹ پر پریڈ میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ ساری نوکری اس مصیبت کا سامنا کرتے گزر گئی۔ لیکن بنگلور میں چونکہ اس قصے نے اچانک آ دبوچا تھا اس لئے کچھ عرصہ تو قیامت گزر گئی۔ عجیب بات یہ تھی کہ صوفی حمید علی صاحب بھی اس معاملہ میں میری طرح تھے۔ ہم دونوں ٹھیک چھ بجے بستروں سے اتر آتے تھے۔ پچیس منٹ میں مندرجہ ذیل کام کرنے تھے۔

''چھوٹا حاضری'' دو عدد بسکٹ یا ایک عدد کیلا یا ایک عدد سنگترہ اور ایک پیالی چائے۔

رفع حاجت، غسل، شیو، نماز، وردی پہننا اور ضروری ہو تو کاغذ قلم کتابیں سنبھالنا وغیرہ وغیرہ۔

سخت ''نیک ٹو نیک'' ریس ہوتی تھی۔ ہم کبھی ایک دوسرے کو ہرا دینے کیلئے ''خفیہ ہتھیار'' بھی استعمال کرتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وردی پہلے پہن لی اور شیو بعد میں کر لیا۔ نماز سے پہلے فارغ ہو گئے اور غسل بعد میں کر لیا (لڑکے زیادہ اور غسل خانے کم تھے۔ اس لئے بسا اوقات خالی نہیں ہوتے تھے) یا چھوٹا حاضری کو آخر پر رکھ چھوڑا۔ لیکن پچیس منٹ میں اور وہ بھی سو کر فوراً اٹھنے کے بعد کیا کچھ ہو سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ کبھی ایک نے سائیکل کو اس کے سٹینڈ سے پہلے دھکیل لیا کبھی دوسرے نے اور دونوں ہی ہمیشہ پانچ دس منٹ لیٹ رہے۔ کمرے کے دروازے سے لے کر پریڈ گراؤنڈ تک ہم خوب لاف زنی کرتے۔ لیکن جونہی پریڈ کو ''اٹن شن'' ہوتے دیکھتے چپکے سے دیوار کی اوٹ میں دبک کر کھڑے ہو جاتے اور پریڈ کی روانگی سے ذرا پہلے جب افسر لوگ چلے جاتے تو ہم اپنی کمین گاہ سے نکل کر سائیکلوں کی دہری قطار سے جا چپکتے (بنگلور میں ہم عموماً سرکاری سائیکلوں پر پریڈ پر جایا کرتے تھے) اس بھاگم بھاگی میں مخبوط الحواسیاں بھی ہو جایا کرتی

تھیں۔ مثلاً ایک دن میں نے ایک نیکر پر ایک اور پہن لی۔ ایک دن پانچ منٹ پہلے تیار ہو کر ٹھوڑی کو اوپر پھینک کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ حمید علی صاحب کو بہت خفت ہو رہی تھی۔ کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور اپنی ٹھوڑی پر انگلیاں پھیر پھیر کر ہنسنے لگے۔ معاً مجھے خیال آیا کہ میں نے شیو نہیں کیا۔ شیو کے بعد صابن پونچھنا تو کئی بار بھولا۔

فوج کی نوکری میں روزانہ پانچ دس منٹ لیٹ ہو جانا امیر حمزہ کی داستان معلوم ہوتی تھی لیکن ایسا ہوا اور سالہا سال تک ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی وجہ سے ایک دو کڑے وقت بھی آئے لیکن رب نے خیر کی۔ بنگلور میں ہم محض حالات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ لڑکوں میں سے ہی کیڈٹ کمپنی کمانڈر اور پلاٹون کمانڈر مقرر ہوا کرتے تھے اور یہی لوگ حاضری لگایا کرتے تھے۔ ٹریننگ کے پہلے کچھ مہینے یہ عہدہ دار ہر ہفتے بدل جایا کرتے تھے۔ چنانچہ سب کی باری آنے کا امکان تھا۔ ہم اس امکان سے بلیک میل کا کام لیتے تھے۔ حالات کی سازگاری کی اس سے بھی معقول وجہ ایک اور تھی۔ وہ یہ کہ ایک سو بیس تیس لڑکوں میں سے نوے فیصدی پنجابی تھے جن میں زیادہ تر صوفی صاحب کے شاگرد تھے اور میرے دوست۔ ہم نے ایک طرح کی ٹریڈ یونین بنا رکھی تھی اس طرح سے کوئی دوسرا سر نہیں آتا تھا اور لوگ ہماری غیر حاضری میں حاضری لگا دیا کرتے تھے۔ اس سے بعض اوقات الجھنیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ مثلاً ایک دفعہ میں چھ گھنٹے تک پریڈ سے غیر حاضر رہا لیکن سرکاری طور پر حاضر تھا۔ ہوا یہ کہ ہم صبح کی پریڈ سے فارغ ہو کر لنچ کھانے گئے۔ کھانے کے بعد میں انگریزی رسالوں کو جن کی ایک کھیپ اسی دن ولائیت سے آئی تھی پڑھنے لگا اور پڑھتا رہا۔ میری مدہوشی کی حالت میں لوگ ایک ایک کر کے میس (Mess) سے چلے گئے۔ کوئی اڑھائی بجے میں نے ایک رسالے سے اپنی ناک باہر کی تو دیکھا دنیا سنسان پڑی ہے۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ سائیکل لے کر پریڈ گراؤنڈ کی طرف لپکا۔ وہاں بھی شہر خموشاں کا سماں تھا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ کمپنی کہاں غائب ہو گئی ہے۔ ادھر ادھر کھوج نکالا۔ کوئی پتہ نہ چلا۔ اس دن سکول سے کوئی تین میل دور باہر اگرم (Agram) کے میدان میں فائینگ پٹرول (لڑاکا دستہ) کی ڈیمانسٹریشن (Demonstration) تھی۔ سب لوگ وہاں چلے گئے تھے۔ سکول کے بڑے چھوٹے افسر بھی سب وہاں جمع تھے۔ میں نے سوچا اب وہاں گیا تو جگ ہنسائی ہو گی اور سارا راستہ پہاڑی پر بیٹھے ہوئے لوگ میری سائیکل سواری کی داد دیں گے۔ افسروں کے سامنے جو رسوائی ہو گی وہ اس کے علاوہ اور بعد میں آنے والی سزا سونے پر سہاگہ۔ چپکے سے اپنے کمرے میں آ

گیا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا۔ کھڑکی کے راستے باہر آ کر دروازے کو جوں کا توں تالہ لگا کر واپس کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا۔ کھڑکی کی چٹخنی لگا کر سو گیا۔ رات کو آٹھ بجے لوگ واپس آئے۔ پہلا آدمی جو ہمارے کمرے میں داخل ہوا وہ کیڈٹ کمپنی کمانڈر تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ بولا یار تم نے مجھے بچا لیا۔ ورنہ میں تو گیا تھا۔ میں نے حسب دستور تمہارے حاضر ہونے کی رپورٹ دے دی تھی۔ سارا راستہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ لیکن تم نہ آئے۔ وہاں ہم سب کو ڈیمانسٹریشن دیکھنے کیلئے ایک ٹیلے پر بٹھا دیا گیا۔ لیکن کس کافر کو خبر ہے کہ چھ گھنٹے کیا ہوتا رہا۔ میری آنکھیں سڑک پر جمی تھیں۔ کہیں تم نہ آ دھمکو۔

ہماری خوشی قسمتی تھی کہ ہم دو کے علاوہ کوئی لڑکا دیر سے نہیں آتا تھا۔ ایک دو نکھٹو ہر محفل میں سما جاتے ہیں۔ بلکہ ان سے محفل کی بوقلمی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تعداد بڑھ جائے تو بدمزگی ہو جاتی ہے۔ باقی لڑکے وقت سے پہلے حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ ڈیماکلیز کی تلوار کے نیچے سے ہر روز گزرنے کے لیے دل گردے کی ضرورت ہے۔

اگر کسی کو اب بھی یہ اندازہ ہوا ہو کہ بنگلور میں مَیں ایک چاق و چوبند قسم کا انسان تھا تو یہ صحیح نہیں ہو گا۔ ایسا نظر آنے کا کوئی احتمال تھا بھی تو میری ٹوپی نے بڑی حد تک دور کر دیا تھا۔ یہ مجھے سرکاری طور پر ملی تھی۔ پورے کوارٹر ماسٹر سٹور میں یہی ایک تھی جو میرے سر پر فٹ آئی تھی۔ وہ بھی کوارٹر ماسٹر کے گھٹنے پر کلبوت چڑھنے کے بعد۔ سو یہ ہیٹ تو فوجی ضرورت تھی۔ اس کا رِم ڈیڑھ انچ دبیز تھا۔ جب میں اسے پہنتا تھا تو اس کا پر تو میرے شانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ میری آنکھیں بمشکل سامنے دیکھ سکتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا آدمی نے ٹوپی نہیں بلکہ ٹوپی نے آدمی پہن رکھا تھا۔ میری انمل بے جوڑ حرکتیں اس کی بدولت بہت واضح ہو گئیں تھیں۔ صوفی صاحب نے بہتیرا کہا کہ اس کو بدل لو لیکن میں اڑا رہا کہ سرکار نے کمیشن مجھے دینا ہے ٹوپی کو نہیں۔ وہی ہوا جس کی توقع تھی، میرا نام کمزور لڑکوں کی فہرست میں درج ہو گیا۔ دراصل اس میں قصور صرف ٹوپی کا نہ تھا میرے اڈھب پن کو بھی تھا۔ ایک دن گورا سارجنٹ ہمیں کیموفلاج (خود کو چھپا کر کاروائی کرنا) کی مشق کروا رہا تھا۔ اس نے ہمیں سب کو ایک سمت کو منہ کر کے کھڑے ہونے کو کہا۔ دوسری سمت کچھ لڑکوں سے کہا کہ جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر اپنی رائفلوں سے ہماری طرف شست لے لیں۔ یہ ہو گیا تو ہمیں گھوم کر کھڑا ہونے کو کہا اور ایک ایک سے پوچھنے لگا کہ کتنے آدمی دیکھ سکتے ہو۔ میری باری آئی تو میں نے باقیوں سے ایک زیادہ بتا دیا۔ اس پر وہ بگڑ گیا کہنے لگا۔ اتنے تو میں بھی نہیں

دیکھ سکتا۔ میں نے کہا میں تم سے اونچا ہوں۔ اس پر وہ میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا کتنے زیادہ اونچے ہو۔ اس پر تکرار ہو گئی اور اس نے رپورٹ کر دی۔

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ نیکی اور بدی، محبت اور نفرت، مثبت اور منفی ایک ہی حقیقت کے مخالف مظہر ہیں اور دونوں میں ایک نہایت باریک پردہ حائل ہے جو پیہم کبھی ادھر کبھی ادھر پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔ جو ٹوپی میری مشکلوں کی مائی باپ تھی وہی ٹوپی ان کو آسان کرنے میں کارگر ہوئی۔ کمزوروں کی فہرست میں آنے کے کوئی ایک ہفتہ بعد ہمارا فیلڈ کرافٹ کا مقابلہ ہوا۔ اس عسکری مشن کا خیال سیپر (Sapper) کے ایک ناول سے لیا گیا تھا دو دشمن ایک بے آباد جزیرے پر اکٹھے ہو گئے۔ دونوں کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ لیکن دونوں ہی جانتے تھے کہ پانی صرف ایک چشمے پر دستیاب ہو سکتا تھا، جو برابر کے فاصلے پر جزیرے کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ دونوں کے پاس ایک ایک بندوق تھی اور دو دو کارتوس۔ پانی پیے بغیر جان نہیں بچتی تھی اور دشمن تاک میں تھا۔ یہی خیال دے کر ہم میں سے دو لڑکوں کو ٹوٹی پھوٹی جھاڑیوں والی زمین کے ایک قطعے پر ایک دوسرے سے آٹھ سو گز کے فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا۔ بیچ میں ایک جھنڈی گاڑ دی، جو چشمے کو ظاہر کرتی تھی۔ سیٹی بجنے پر حکم تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے جھنڈی تک پہنچنا ہے لیکن ایسا کرنے کیلئے دشمن کو مارنا یا اس سے اپنی جان بچانا ضروری ہے۔ اس کیلئے ایک رائفل اور دو پھوکے راؤنڈ ہر لڑکے کو دیئے جاتے تھے۔ جج اور باقی پلاٹون ایک ٹیلے پر بیٹھ کر تماشہ دیکھتے تھے۔ اپنی باری آئی تو میں نے اور میرے مد مقابل نے ایک دوسرے کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ ایک موقع پر دونوں میں صرف سو گز کا فاصلہ رہ گیا۔ اس سے آگے کوئی آڑ نہیں تھی اس لئے دونوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ کچھ عرصہ بعد میں نے جو ہلنا چاہا تو معلوم ہوا کہ محترمہ ٹوپی صاحبہ جھاڑی میں بری طرح الجھ کر رہ گئی ہے اور اس عشق سے ان کو نجات دلانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے ٹوپی کو اس کے حال پر چھوڑا اور خود نیچے سے کھسک گیا۔ میرے ''دشمن'' دوست اسی کی طرف انگشت نمائی میں محو تھے اور نہایت دلجمعی سے شست لگائے بیٹھے تھے کہ میں نے چپکے سے جا کر جھنڈی اکھاڑ لی۔ تحسین و آفرین کے ڈونگرے برس گئے۔ میں مسکراتے ہوئے ٹوپی کو جھاڑ پونچھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا

؎ تمہی نے درد دیا ہے تمہی دوا دینا

شومئی قسمت اسے کہتے ہیں کہ صبح کے وقت میری ٹوپی فتح و کامرانی کی مستی میں جھوم رہی تھی اور اس شام کو میں چھوٹی رم کی ایک دوسری ٹوپی کیلئے بازار میں آرڈر دے رہا تھا۔

جب میری نظر سر سے اتر کر اس زمانے کے ''پاؤں'' پر پڑتی ہے تو جسم میں جھرجھری سے آجاتی ہے۔ فوجی بوٹوں کے ساتھ میری پہلی ملاقات بہت صبر طلب تھی۔ ان کے بغیر چارہ نہیں تھا لیکن ان کے ساتھ نبھتی بھی نہیں تھی۔ شروع شروع میں میرے پاؤں کے تلووں میں اتنے بڑے بڑے چھالے پڑ جاتے تھے کہ میں دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا کرتا تھا۔ اگر میں کہوں کہ سارا پاؤں آبلہ ہوتا تھا جس میں کہیں کہیں تندرست کھال کے داغ ہوتے تھے تو اس میں بہت کم مبالغہ ہوگا۔ اس سے اتنا ہوا کہ ایک رمز سمجھ میں آ گئی کہ شاعر لوگ آبلہ پائی کے ساتھ خارِ مغیلاں پر چلنا کیوں پسند کرتے ہیں اور بدی کی نفی بدی سے کس طرح ہوتی ہے۔ جب میں اپنے آبلوں کو ہر شام سوئی سے چھیڑا کرتا تھا تو سوچتا تھا کہ میں جو شاعروں پر ان کی دشت نوردی کی وجہ سے ساری عمر ترس کھاتا رہا ہوں تو یہ محض میری سادگی تھی ورنہ چھالوں کے پھوٹنے میں جو راحت ہوتی ہے اس کو وہ لوگ کیا جانیں جن کے کبھی چھالے ہی نہیں پڑے۔ خاص کر وہ چھالے جو مجھے نصیب تھے۔

چھری کانٹے، بیرے خانسامے، کوٹ پتلون کے اس اجنبی ماحول میں مجھے اپنے ''جٹ پن'' سے بہت کوفت ہو رہی تھی۔ میری حالت اس بیل گاڑی کی سی تھی جسے پکی سڑک پر ایک تیز رفتار کار کے پیچھے باندھ دیا جائے۔ جس کا انگ انگ تو اس اجنبی رفتار سے نالاں ہو لیکن جس کا ذہن (اگر بیل گاڑی کا ذہن ہوتا ہے تو) اپنی درگت پر اتنا تنگ نہ ہو جتنا اپنے کھڑکھڑانے پر شرمندہ۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے آپ کو (اور اگر ہو سکے تو دوسروں کو بھی) ایسا دیکھوں کہ گویا ہمیشہ سے ہل کی ہتھی کے لیے نہیں بلکہ افسرانہ ناز و نعم کیلئے بنا ہوں۔ آدمی کو جب خود پسندی کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کیلئے عجیب عجیب ذریعے نکال لیتا ہے۔ چنانچہ میں دوستوں میں بیٹھ کر اکثر اپنے بلڈی Bloody (فوج کی پسندیدہ گالی) بوٹوں کو کوسا کرتا تھا (بنگلور پہنچ کر میں نے انگریزی میں گالیاں دینا سیکھ لیا تھا۔ میرے پچھتر فیصد (75%) ساتھی تو اس سے بھی بڑھ گئے تھے اور انہوں نے شراب نوشی اور سگریٹ پینا بھی، کچھ تو جیب کی فراغت کی بدولت لیکن زیادہ تر نے صاحب بہادری کے لوازمات سمجھ کر شروع کر دیا تھا۔ بوٹوں پر ناک بھوں چڑھانے کے بعد میں دوستوں کی توجہ اپنے ''نرم و نازک'' پاؤں کی طرف راغب کرتا تھا کہ

؎ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

کس طرح شاہان گیتی آراء کا یہ نونہال شہزادی دولت جمال کی تلاش میں فوجی بوٹ نامی دیو سیاہ فام کے ہاتھوں بے حال و پریشان ہے۔

لیکن میری ''سیف الملوکی'' زیادہ عرصہ قائم نہ رہی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرے علاوہ بہت کم لوگوں کے پاؤں کی چپقلش فوجی بوٹوں کے ساتھ تھی۔ بلکہ جتنے بابو ٹائپ تھے ان میں سے تو کسی کو بھی اس بناء پر زک نہیں پہنچی تھی۔ لالے، پنڈت، شیخ، خوجے اور دوسری شہری مخلوق بنگالی اور مدراسی بابو، سیاہ وسفید اینگلو انڈین سب اپنے بوٹوں کی طرف دیکھتے تک نہیں تھے۔ اگر ادھر توجہ کرتے تھے تو محض اوپری چمک دمک کی خاطر اور میری یہ حالت تھی کہ جب بھی بوٹ پہنتا تو میرا ذہن ان کے اندر ڈیرے ڈال لیتا تھا۔ کبھی انگلیوں پر ستار بجا رہا تھا اور کبھی ایڑی پہ بربط بج رہا ہے۔ بھاگ دوڑ کے وقت تو تگنی کا ناچ ناچنے لگتا تھا۔ میری نظریں بھی آنکھ بچا کر ادھر ہی آنے کی تاک میں رہتی تھیں۔ ان باتوں نے میرے پہلے تھیسس (Thesis) کو بالکل آبلہ پا کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس وقت نکل گئی جب میں نے اپنے پاؤں کی ہسٹری پر غور کرنا شروع کیا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ تھوڑا ہی عرصہ پہلے بھینسوں کے پیچھے پیچھے میں سارے گاؤں میں ننگے پاؤں پھرا کرتا تھا اور یہ کم وبیش روز کا معمول تھا۔ مجھے وہ واقعہ بھی یاد ہے جب میں نے جون کے مہینے میں دوپہر کے وقت ایک بہت بڑے ٹیلے کو جو میرے سکول کی راہ میں پڑتا تھا ننگے پاؤں عبور کیا تھا۔ میں پانچ سات قدم بھاگ کر اپنی لکڑی کی تختی پر کھڑا ہو جاتا اور پھر ستا کر پانچ چھ قدم اور بھاگ لیتا۔ لیکن ٹیلے کی چوٹی پر ریت اتنی گرم تھی اور میرے پاؤں اتنے تپ گئے تھے کہ میرے لئے ایک قدم چلنا بھی محال تھا۔ میں نے ایڑیوں اور انگلیوں کا باری باری استعمال کر کے بھی دیکھا لیکن کام نہ بنا۔ کیونکہ پاؤں کا جو حصہ بھی زمین پر پڑتا تھا نرم ریت میں دھنس جاتا تھا۔ اب یہ بھی ممکن نہ تھا کہ میں اس ٹیلے کے گرد چکر کاٹ کر گزر جاتا۔ چوٹی پر جو کھڑا تھا، یہ بھی ناممکن تھا کہ وہیں کھڑا کھڑا ریت کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کرتا۔ تاہم

؎ ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔

میرے دماغ کو جب آفتاب عالمتاب نے خوب گرما دیا تو دور دور کی سوجھنے لگی۔ میں پہلے تختی پر کھڑا ہو جاتا اور پھر بستہ آگے رکھ کر اس پر۔ چنانچہ اس ہفتخواں کو عبور کرنے کی مجھے اتنی خوشی ہوئی تھی کہ میرا سارا دکھ درد دماغ کے کسی جلے ہوئے کونے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ گریبان میں اس طرح منہ ڈالنے سے اتنا مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ میرے پاؤں پر چھالے محض بوٹوں کے ظلم کی وجہ سے نہیں تھے بلکہ اس میں پاؤں کی سرکشی کو بھی دخل تھا۔ اتنے عرصے کی آزادروی کے بعد ان کڑی پابندیوں کا نتیجہ جنگ وجدل نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔ البتہ افسوس کی بات یہ تھی کہ میرے پاؤں

ہٹ دھرمی میں یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ بوٹ اور ان کی لائی ہوئی پابندیاں سب ان کی خدمت کیلئے ہیں یعنی ان کی آزادروی کی رینج (Range) بڑھانے کیلئے۔ انسان کی مختلف ملتوں اور ان کے پیغمبروں، مصلحوں، راہنماؤں کے درمیان چپقلش اور خون خرابے کا بھی شاید یہی فلسفہ تھا۔ نہ ان ملتوں نے دیکھا تھا اور نہ میرے پاؤں دیکھ رہے تھے کہ پابندی، پابندی میں فرق ہوتا ہے۔ ایک پابندی ہزاروں آزادیوں کو جنم دیتی ہے۔ دوسری پابندی ڈائن ہوتی ہے جو انسان اور اس کی آزادیوں کو ہضم کر جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بوٹوں نے میرے ناک میں دم کر رکھا تھا لیکن یہ گویا ماں کی ممتا سے تھا۔ ڈائن کی بوالہوسی نہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ بنگلور میں ''خاندانیت'' کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ورنہ میں اتنی آسانی سے ہمت نہیں ہارتا۔ کھانا، پہننا، رہنا، سہنا سب سرکاری خرچ پر تھا اور سب ایک ہی طرز کا۔ تعلیم بھی سب کی تقریباً ایک جیسی تھی۔ مجھے اپنے سادہ اور سستے سوٹ کی طرف سے خطرہ تھا کہ اگر سویلین کپڑے پہننے پڑے تو بھرم کھل جائے گا۔ لیکن اللہ بڑا ستار ہے اس نے انگریز کو سمجھا دیا ہوگا کہ ان ہندوستانیوں میں کئی بیچارے، بہت غریب ہیں تم نے ان سے کام لینا ہے نہ کہ ان کی غریبی کو مشتہر کرنا۔ اس لئے سویلین کپڑوں کا پہننا ممنوع کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تنخواہ بھی معقول تھی غرضیکہ اس قسم کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ آدمی اپنے آپ کو بھول کر اپنے کام میں ہمہ تن گوش ہو جائے۔ ایک اور بات جس نے زندگی میں آسانی پیدا کر دی تھی وہ گلا کاٹ مقابلے کا فقدان تھا۔ کم سے کم صلاحیت کا ایک پیمانہ مقرر کر دیا گیا تھا جو بھی اس پر پورا اترتا تھا، کامیاب تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اتنے لڑکوں میں صرف اتنے فیصد کو کمیشن ملے گا۔ اونچا اڑنے والوں کے لیے مواقع کی کمی نہیں تھی۔ مجھے زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ مساوات کے لیے بڑے بڑے لیکچر پلانے اور وعظ دینے کی بجائے اگر ضروریات زندگی کی فراوانی اور تقسیم کی طرف توجہ دی جائے تو زیادہ اچھا ہو۔

بنگلور کا قیام میری زندگی کے خوشگوار ترین لمحوں میں سے ہے۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہو کہ عمر بھر ''عسر'' سے ذک اٹھائی تھی اور اب پہلی بار ''یسر'' سے راہ ورسم قائم ہوئی تھی لیکن اس کی اور بھی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً پڑھے لکھے محنتی، خوش وضع، خوش خلق ہم عمروں کی صحبت جن کے ساتھ زندگی کا ایک ایک لمحہ مسرت اور شادمانی سے بھرپور تھا۔ مجھے اپنے عزیز دوستوں میں سے کئی وہاں میسر آئے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی وہاں ہوتی رہتی تھیں لیکن ان کی حیثیت مہر و وفا کی اس منور

فضا میں وہی تھی جو رخِ تاباں پر خم کاکل کی ہوتی ہے۔ بس یہ کھلی ہوا، صاف ستھرے مکان، لذیز اور مقوی غذا، عمدہ لباس اور جسمانی و دماغی ورزش، خرچ کرنے کو پیسہ۔ گویا ایک جنت تھی۔ البتہ اس جنت میں یہ گھناؤنا خیال کہ ہیر کا سنگھار، رانجھے کے لیے نہیں کھیڑے کے لیے ہے، شیطان کی طرح گشت لگاتا رہتا تھا۔

باب نمبر 3

زادِ راہ

دنیا کے کسانوں کی کچھ اقدار مشترک ہیں لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جو ایک خطے کے لوگوں کو اس خطے کی تاریخ، آب و ہوا اور مخصوص معاشرتی حالات کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں۔ پنجاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خطہ ہمیشہ سے غیر ملکی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ زیادہ تر لوٹ کھسوٹ تو ہندوکش سے ادھر کے لوگوں نے کی ہے لیکن کبھی کبھار دِلّی سے ادھر والے بھی چڑھ آتے تھے۔ انگریزوں سے پہلے بادشاہت کے دور میں دُلّا بھٹی کے علاوہ صرف دو پنجابی ملتے ہیں جن کو تاریخ کے اوراق میں قابلِ اعتنا سمجھا گیا ہے۔ سکندرِ اعظم والے راجہ پورو (پورس اعظم) اور رنجیت سنگھ، باقی گھناؤنی صدیاں غیر ملکی فوجوں کی اڑائی ہوئی گرد سے اٹی پڑی ہیں اور کان لگا کر سنو تو یہ پتا چلتا ہے کہ فوجی گھوڑوں کی ٹاپوں نے پنجاب کی آواز کو مدھم سائیں سائیں میں بدل دیا ہے۔

میں ایک ملک کو غیر ملکی حملہ کی زد میں دیکھ چکا ہوں۔ میرے دیکھتے دیکھتے پانچ چھ مہینے میں برما کی جو ذلت ہوئی اس کا خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کو سامنے رکھ کر جب میں اپنی جنم بھومی کے بارے میں سوچتا ہوں تو دل بیٹھ جاتا ہے کہ یہ بدنصیب ملک ایک دفعہ نہیں دو دفعہ نہیں بلکہ ہزاروں سال سے حملہ آوروں کی دستبرد کا شکار رہا ہے۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ کس طرح پشت ہا پشت سے میرے وطن کے لوگ رات کے وقت بھاگتے ہوئے ظالم کو لوٹتے رہے ہیں اور دن چڑھے نئے ظالم کے گھوڑوں کیلئے دانہ پانی اور خود اس کے لئے تحفے تحائف اور خیر سگالی کے جذبات لے کر حاضر ہوتے رہے ہیں۔ تاریخ نے اگر کسی قوم پر ظلم ڈھایا ہے تو وہ پنجابی ہیں۔ چنانچہ پنجاب کی مشہور مثل ہے کہ "کھادا پیتا لاہیدا تے باقی احمد شاہے دا"۔ یعنی جو کچھ کھا پی لیا وہ غنیمت ہے اس لئے کہ جو کچھ باقی بچے گا وہ احمد شاہ لوٹ کر لے جائے گا۔

؎ خراب کیونکر نہ ہو شہر دل کی آبادی
ہمیشہ لوٹنے والے ہی اس دیار میں آئے

بلھے شاہ نے اپنی مخصوص طرز میں پنجاب کا رونا یوں رویا ہے۔

؎ در کھلیا حشر عذاب دا
برا حال ہویا پنجاب دا

اور لوگوں پر بھی حملے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ہے۔ کبھی پٹ گئے اور کبھی آنے والے کو مار بھگایا ہے۔ ان کی تاریخ میں اگر پٹنے کا بیان ہے تو مار بھگانے کا حال بھی ہے۔ جب پٹ رہے ہوں تو پیٹنے کے واقعات یاد کر کے حوصلہ مندی کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے لیکن ہمارے حملہ آور ہمیں کیڑوں کی طرح روندتے چلے گئے۔ جو کابل سے اٹھا اس کی نظر پانی پت پر تھی اور جو دِلّی سے اٹھا وہ کابل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گویا اس پانچ دریاؤں کی زمین پر خوددار انسان آباد نہیں تھے بلکہ حملہ آور کے گھوڑوں کیلئے گھاس اگتا تھا۔ فوج کے ستانے کیلئے موزوں پڑاؤ تھے اور ہم نیچے دبک کر دونوں کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ ہم دوسروں کی خاطر فرانس سے لیکر جاپان تک دھرتی کو اپنے خون سے لال کرتے رہے لیکن پنجابی پنجاب کی خاطر کم ہی لڑے ہیں.......... اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ ثمر قند سے لے کر ہسپانیہ و مراکش تک کی خاک چھانتے رہے ہیں کہ دوسروں کی عظمت کی حرارت ہم تک بھی پہنچ جائے اور کچھ اپنی عظمت کے نشان کو کوروکشیتر سے لے کر لنکا تک کی دھرتی میں ڈھونڈتے رہے ہیں۔ ہمیں پانچ دریاؤں کی سرزمین میں گھاس پھونس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ ہماری زبان گنواروں کی زبان ہو گئی ہے اور ہم میں سے جن کو مقدور ہے وہ اپنے بچوں کو اس کے نزدیک تک نہیں پھٹکنے دیتے۔ ہمارا لباس غیر مہذب ہمارے اوضاع و اطوار وحشیانہ، فنون لطیفہ سے ہمیں شغف نہیں۔ علم کو ہم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حیوانیت سے انسانیت کی طرف ہم نے بہت تھوڑی منزلیں طے کی ہیں۔ روزمرہ بھی ہزاروں وحشتیں ہماری حیوانیت کو بھرے بازار میں ننگا کرتی رہتی ہیں۔

تمام تاریخ میں لاہور سے اوپر ٹیکسلا کے علاوہ کوئی علم و فضل کا مرکز نظر نہیں پڑتا۔ نہ ہماری اپنی آرٹ موسیقی، علم و ادب کی روایات ہیں۔ جو ہیں وہ بھی دبی دبی اور بے ربط سی۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔

؎ غزل کے کہنے کو دن چاہئیے ہیں فرصت کے

تاریکی گھنی ہو تو مدھم سی کرن بھی چنگارہ نظر آتی ہے بعض اوقات یہ کرن ایسی تاریکی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ موت کی مساوات کی طرح ذلت کی مساوات نے ہم میں ایک طرح کی اندرونی جمہوریت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اب ہم میں کوئی بڑا ہے تو ہم فوراً کہہ دیتے ہیں کہ اس کی بڑائی کی اساس اس کے باپ دادا میں سے کسی ایک کی قوم و ملک کے ساتھ غداری پر قائم ہے۔ اس طرح اس شخص کی بڑائی کا دعویٰ ہمارے ذہنوں میں اس کی خاص الخاص ولالت کا ثبوت بن جاتا ہے۔ حالت کچھ اس قسم کی ہے کہ ہم میں جتنا کوئی بے توقیر اور بے مایہ ہے اتنا ہی اس بات کا امکان ہے کہ وہ اور اس کا خاندان غداروں سے پاک ہو۔ تاریخی روایات کا نہ ہونا بھی بسا اوقات سودمند ہو جاتا ہے۔ تاریخی روایات اگر ایک وقت سہارا ہوتی ہیں تو دوسرے وقت گردن کا بوجھ بھی بن جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ اس نہ ہونے کی برکت سے ماضی کے گیت گانے کی بجائے حال اور مستقبل سے الجھنے کے عادی ہیں۔ ہمارے لئے یہ سعادت کیا کم ہے کہ ہمارے شاعروں نے بادشاہوں، امیروں وزیروں کی مدح خوانی کی بجائے عام لوگوں کے عشق و محبت کی کیفیتیں بیان کی ہیں۔ ہمارے ادب کا سب سے بڑا شاہکار ایک معمولی جاٹ اور جٹی کے عشق کا قصہ ہے۔ اس میں ہماری رہت سہت کا خوبصورت اور صحیح خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد ذرہ برابر بھی شک نہیں رہتا کہ مٹی میں لت پت جانور نما کسانوں کی قلبی وارداتیں، ذوق اور بلند پائیگی کے لحاظ سے سرکار دربار کے دیبا و حریر والوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہماری زبان کا یہ شاہکار دنیا بھر کے عوامی ادب کی صفِ اول میں جگہ پاتا ہے۔

فی زمانہ جبکہ دنیا بڑی تیز رفتاری سے ایک ہو رہی ہے اور انسان کی تخلیقی دولت سے ہر کوئی بہرہ مند ہونے لگا ہے کسی ایک قوم کی بے مائیگی ضروری نہیں ہے کہ اس کے فرزندوں کو کمتر انسان بنائے۔ دنیا بھر کا ادب اب ہر زبان میں چھپنے لگا ہے۔ موسیقی، رقص، نقاشی اور مصوری کی بین الاقوامی شکلیں پیدا ہونے لگی ہیں۔ ذرائع آمد و رفت کی آسانی اور تیز رفتاری نے ایک بین الملّی انسان کی تشکیل شروع کر دی ہے۔ جس طرح انفرادی سطح پر استبداد اور فضیلت کی دیواریں گر رہی ہیں اسی طرح قومی سطح پر غرور و نخوت کو کمینگی اور درندگی کے نام دیئے جا رہے ہیں۔ صرف تاج ہی نہیں اچھل رہے اور تخت ہی نہیں گر رہے بلکہ ہر وہ نشان اور ادارہ جو انسان پر انسان کی پیدائش کی بناء پر فضیلت کی گواہی تھا، مسمار ہو رہا ہے۔ مزدوروں کے بچوں نے سپٹنک (Sputnik) اڑا کر

آکسفورڈ اور کیمبرج کی بلند پروازی کو مات دے دی.........اس کے باوجود یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اقوام عالم کی برادری میں اپنا حصہ لے کر جائیں ورنہ عزت اور خوداعتمادی کھو بیٹھیں گے۔ تاریخ نے ہمیں پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ لیکن ہمارے لوگ دل والے ہیں اور زندگی کی آزمائش میں کچھ نہ کچھ کرتے رہے ہیں۔ آخر ٹیکسلا کی یونیورسٹی، رِگ وید کی تصنیف، بابا نانک، بابا فریدؒ، مادھو لعل حسینؒ، وارث شاہؒ، بلھے شاہؒ، میاں محمد بخشؒ، خواجہ فریدؒ، اقبال ہر کھیت کی مولی نہیں ہیں۔ ان میں ضرور اس سرزمین کی تاثیر کو دخل ہے۔

پہلی جنگ عظیم کا ذکر ہے پنجاب سے کچھ فوجیں فرانس گئیں۔ ان میں ایک پنجابی صوبیدار بھی تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اداس ہو گئے۔ وطن کی یاد نے ستایا۔ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ ایک دن کسی کھیت میں سے گزر رہے تھے کہ ایک پودے پر نظر پڑی جو پنجاب کی کسی جڑی بوٹی سے مشابہ تھا۔ رک گئے۔ دیر تک رُکے رہے اور اسے ''وطنے دی بوٹیے نی'' (اے میرے وطن کی بوٹی) کہہ کر خطاب کرتے رہے۔ اس سرزمین میں، اس کی جڑی بوٹیوں میں، چرندوں پرندوں میں، آب و ہوا میں، بو باس میں، دریاؤں میں، پہاڑوں میں، کچھ تو خصوصیتیں ہیں جو اس کی اپنی ہیں اور جن میں پڑ کر ایرانی، تورانی، آریا، دراوڑ، مغل، پٹھان، سیّد، یونانی یہیں کے ہو رہے ہیں۔ غیر ملکی راگ یہاں کی لَے میں بدل جاتے ہیں۔ غیر ملکی خیالات یہاں کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یوں ٹیکسلا ایتھنز کی نقل نہیں بنتا بلکہ اپنی مخصوص شخصیت اجاگر کرتا ہے۔ کچھ تو ہے جس نے ہمیں لاہور دیا ہے۔ جو لاہور ہے، بصرہ یا بغداد، ثمرقند، بخارا یا کابل، تہران یا متھرا، بنارس، دلی یا لکھنؤ نہیں ہے۔ ہمارے کلچر کے خزانے مدفون پڑے ہیں جن کو نکالنا ہمارا کام ہے۔ تاکہ جب عالمی تہذیب کی رنگا رنگ دلق اپنی پوری ضو پاشیوں کے ساتھ دلوں کو بھرمائے تو اس میں ہمارا ٹکڑا بھی جگمگ جگمگ کر رہا ہو۔

تاریخی روایات سے چھٹکارے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے معاشرتی رجعت پرستی سے بھی آزادی مل گئی۔ ہمارے دیہات کی فضاء توہم پرستی، ذہنی فلاکت اور تنگ خیالی کیلئے بہت سازگار ہے۔ ہزاروں سالوں سے نہ ہمارے بیلوں میں کوئی فرق آیا نہ اس منحنی لکڑی میں جسے وہ بطور ہل کھینچتے ہیں۔ اس عرصے میں ہمارے مکانوں میں بھی کوئی خاص فرق نہیں آیا اور نہ طرز رہائش میں۔ موسم بھی وہی ہیں اور گاؤں کی پگڈنڈیاں بھی وہی۔ اگر انسان بھی وہی رہیں یا رہنا چاہیں تو عجیب بات نہیں ہے۔ دریاؤں کی طغیانی، طوفانِ باد و باراں، وبائی بیماریاں اور بہت سی بلائیں جن پر ابھی

ک ہمارے دیہاتی انسان کو قدرت حاصل نہیں ہوئی، رہی سہی کسر پوری کر دیتی ہیں۔ اس ماحول میں پل پوس کر مجھے بھی ہر نئی چیز سے وحشت ہوتی تھی اور ہر نیا خیال میرے لئے اس طرح تکلیف دہ تھا جس طرح تازہ ہوا کا جھونکا بیمار جسم کیلئے ہوتا ہے۔ سالہا سال تک ہر نئی بات کے بارے میں میرا ردعمل یہ رہا ہے کہ لڑ جاؤ، مت مانو۔ خبردار دیکھ کر چلو۔ اپنی منفیت دور کرنے کیلئے مجھے بہت جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ اب تک یہ عادت نہیں گئی۔ معاملات کا روشن پہلو اگر آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہو تو میری جبلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کوئی کالی دھاری نظر آ جائے۔ میرے خیال میں یہ دنیا بھر کے کسانوں کا خاصہ ہے کہ وہ بہت شکی مزاج ہوتے ہیں۔ کسانوں کو سمجھنے کے لیے ان کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں سال میں دو بڑی فصلیں ہوتی ہیں۔ پانچ چھ مہینے ان کے پکنے کیلئے درکار ہوتے ہیں جبکہ ایک آدھ مہینہ ان کے سمیٹنے میں لگ جاتا ہے۔ فصل کی تیاری کے ایام میں کسان بے بس ہوتا ہے۔ مینہ، آندھی، اولے، بیماریاں، فصل تو ان سب کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا صبر شکر آ جاتا ہے۔ دیہاتی زندگی میں ویسے بھی زندگی کی رفتار مدھم ہوتی ہے۔ سال کے دو تین حصے ہوتے ہیں اور دن رات بھی گھنٹوں اور منٹوں میں نہیں پہروں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اس طرح سال کا زیادہ عرصہ کسانوں کے ذہنی اور جسمانی انجر پنجر بہت ڈھیلے ہوتے ہیں۔ لیکن فصل سمیٹنے کا وقت آیا اور کسان کی کایا پلٹ گئی۔ معلوم ہوتا ہے اس میں ایک دیو آ کر بس گیا ہے۔ وہ اپنی فصل بچانے کے لئے زمین و آسمان کی ہر طاقت، ہر بلا کا مقابلہ کرے گا۔ جان لڑا دیتا ہے۔ وہ اپنے مذہب و توہمات اور دوسری مصلحتوں کی پوٹلی باندھ کر ایک طرف رکھ دیتا ہے اور جب تک فصل کا آخری دانہ گھر نہیں آ جاتا اس کا بخار نہیں اترتا۔ کسانوں میں اور ان کی تحریکوں میں یہ بات بہت نمایاں ہوتی ہے کہ اول تو وہ کسی نئی چیز کو قبول کرنے میں بہت ہچکچاتے ہیں لیکن ایک بار یقین ہو جائے تو منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ جب بخار اتر گیا تو وہی دھیمگی اور تساہل کا دور دورہ۔

میں جیل میں تھا تو جی بہلانے کیلئے پھول اگایا کرتا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ دیہاتی قیدی پھول اگانے کے فلسفہ کو سمجھنے سے یکسر قاصر تھے۔ اگر پھولوں کی کیاریوں میں ان کو ایک آدھ مولی، گاجر، پودینہ یا کسی اور کھانے کی چیز کا پودا نظر آ جاتا تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ جن کے مذاق زیادہ سلجھے ہوئے تھے ان کی پرواز صرف اتنی ہوتی تھی کہ کسی پھول کے ڈیزائن یا رنگ کو عورتوں کے کپڑوں سے تشبیہ دے دی۔ یہ دیکھ کر مجھ پر وارد ہوا کہ ہم دیہاتی زندگی کی ضروریات

اس مشکل سے حاصل کر پاتے ہیں کہ اس کی آرائش اور بناوٹ کی طرف دھیان دینے کا ہمیں موقعہ ہی نہیں ملتا۔ غنچے کی چٹک، گل کی دمک، نسیم سحری، شفق کی پھلواڑی اور اسی قماش کی دوسری چیزیں جن کا ذکر شاعر لوگ معشوق کے ضمن میں کرتے ہیں اور جو انسانی ذہن کی Refinement (نشوونما) کا مظہر ہیں ان کا فی الحال ہمارے دیہات میں کوئی مصرف نہیں ہے۔

مذہب کا ذکر کیے بغیر ایک دیہاتی کی ہیئت ترکیبی کا صحیح انداز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شہروں خاص کر ماڈرن شہروں کے رہنے والے بجلی لگے گھروں میں رہتے ہیں۔ کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ جہاں وہ روز دیکھتے ہیں کہ کس طرح مشینیں انسان کی خدمت میں لگی رہتی ہیں۔ مشینیں تیل، بجلی یا کوئلہ سے چلتی ہیں۔ کوئی پرزہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس کیلئے کسی عامل حکیم کا دم درود بیکار ہے۔ ایک بے وضو مستری آتا ہے اور ٹھیک کر دیتا ہے۔ آندھی آئے، مینہ برسے، طوفان اٹھے ان کو پسا پسایا آٹا کونے کی دوکان سے مل جاتا ہے۔ نل میں پانی کے اوقات مقرر ہیں۔ بیماری کے علاج کیلئے شفاخانہ پاس ہی ہے۔ یہ لوگ اگر پیروں، فقیروں، ولیوں، بزرگوں وغیرہ کو نہ مانیں تو ان کی ٹانگ نہیں ٹوٹ جاتی۔ دیہات میں اور بات ہے۔ کسانوں کی فصل سورج اگاتا اور پکاتا ہے جس پر انسان کا بس نہیں۔ اس کی فصل کیلئے پانی بادلوں سے برستا ہے۔ جس پر انسان کا بس نہیں۔ اس کا خرمن جلانے کیلئے بجلی آسمان سے گرتی ہے۔ اولے آسمان سے پڑتے ہیں جس پر اس کا بس نہیں۔ سیلاب ایک اور بلائے ناگہانی ہے۔ بیمار ہو جائے تو کوئی ڈاکٹر پاس نہیں اور اسے کسی حضرت، سائیں، شاہ یا سنت، مہاراج سے تعویز گنڈا ٹونہ ٹوٹکا لینا پڑتا ہے۔ یعنی انسان مجبور ہوتا ہے کہ انہی قوتوں کا مقابلہ کرنے کیلئے دوسری الٰہی قوتوں کی مدد چاہئے۔ یہ وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے توہم پرستی ہماری دیہاتی زندگی کا لازمہ بن گئی ہے۔

میرے گاؤں کے لوگ تندخو اور سرکش مزاج مشہور تھے اور گردونواح میں پسند کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ چور ڈاکو وغیرہ نہیں تھے البتہ میلوں ٹھیلوں سے شام کو گھر آتے وقت مٹھائی کی دوکانیں لوٹ لیا کرتے تھے۔ گاؤں میں جمہوریت اس حد تک تھی کہ لڑکے بالے اپنے بڑوں کو نام لیکر پکارتے تھے۔ خوشامد منظور ہوئی تو چچا، تایا، بابا، لالہ جیسے القاب کے ساتھ پکارے جاتے تھے۔ برابر بیٹھ کر حقہ پیتے تھے اور خوش گپیوں میں پورا حصہ لیتے تھے۔ جن کا حافظہ بہت تیز تھا وہ اپنے خاندان کی تین پشتوں تک کے نام بتا سکتا تھا۔ اس سے آگے نہ کسی کی یادداشت کام کرتی تھی نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ مجلس میں جو پہلے آتا تھا جائے صدر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی کے آنے پر اٹھ کر

کھڑے ہو جانے کا رواج نہیں تھا۔

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہاوت مشہور ہے کہ جاٹ اپنے غلّے کے ڈھیر پر کھڑا ہو گیا اور بادشاہ کے ...لیل ہاتوں کو پکار کر بولا۔ کیوں بھئی تمہاری یہ گدھیاں بکاؤ ہیں؟ .... گاؤں میں شراب عام ...الی اور پی جاتی تھی بلکہ بقرعید کے دن گاؤں کے تمام نوجوان شراب پی کر ڈانگوں سے مسلح ہو کر اور ڈھولکیاں، چھینے ہاتھوں میں لے کر میر اسید لی (شاید میر اسد علی کا بگڑا ہوا ہے) کے نوگزے کی قبر پر نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب ایک سال پولیس سے جھڑپ ہو گئی۔ گاؤں کا اٹھارہ اور چالیس سال کی عمر کے بیچ کا ہر مرد گرفتار کر لیا گیا۔ سال بھر تک مقدمہ چلتا رہا جس میں لوگوں کا بہت سا پیسہ خرچ ہو گیا اور کسی میں عید دھوم دھڑکے سے منانے کا مقدور نہ رہا۔

ہم گاؤں کے نکو تھے۔ میرے دادا جان دِلّی کے کسی عربی مدرسہ کے سند یافتہ تھے۔ وہ وہاں سے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر آئے تھے۔ گھر آ کر درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ میں نے ان کی چند ایک کتابیں، قرآن مجید، عربی صرف و نحو، سکندر نامہ جامی وغیرہ کے قلمی نسخے دیکھے تھے۔ لطائف الطوائف تو کالج سے گرمیوں کی چھٹیوں میں پڑھتا بھی رہا ہوں۔ بہت سی کتابیں دیمک چاٹ گئی یا پھر برسات میں آگ جلانے کے کام آئیں۔ والد مرحوم نے دادا جان کا علم تو نہیں پایا لیکن شب بیدار نمازی تھے۔ بہت عسر میں زندگی بسر کی۔ میرے ایک چچیرے بھائی نماز سے بیزار تھے بقول ان کے، "جب کبھی چچا نماز میں تیزی کر دیتے ان پر کوئی نہ کوئی مصیبت آ پڑتی تھی"۔ واقعہ یہ تھا کہ والد کو مصیبت کی اطلاع ان صاحب سے پہلے ہو جاتی تھی۔ میری اماں شاید برادری میں پہلی عورت تھیں جو پڑھنے کے علاوہ لکھ بھی سکتی تھیں اور اس طرح لوگوں کے اچنبھے اور چہ مگوئیوں کا سامان تھیں۔ ہمارے لئے دیو پریوں کے قصوں کی بجائے پیغمبر اسلامؐ بنی اسرائیل کے پیغمبروں، ولیوں، شہیدوں، صلیب و ہلال کی جنگوں اور اسیران مالٹا کے واقعات بیان کیا کرتی تھیں۔

جب میں پاس کے گاؤں میں سکول جانے لگا تو انہوں نے تلقین کی کہ راستے میں ہر وقت "ایاک نعبدو وایاک نستعین" پڑھتا رہوں۔ ان کا جنوں بھوتوں میں اعتقاد تھا اور یہ وظیفہ دفع بلا کے لیے تھا۔ لیکن میں اس وظیفے کو رات کے اندھیرے، دوپہر کے سناٹے، بادلوں کی گھن گرج، آندھی کی چیخ و پکار کے علاوہ استادوں افسروں اور دوسرے زبردستوں کے خلاف بھی استعمال کرتا رہا ہوں۔ جب بھی کوئی کڑی منزل آئی کسی انسانی بھوت سے واسطہ پڑا فوراً اللہ کو میدان میں لا کھڑا کیا اور خود اطمینان سے دنگل کا تماشہ کرنے لگا۔

یہ عقیدہ کہ خدا کا تصور زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے، غلط ہے۔ اب تو محققین نے بہت چھان بین کے بعد انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں خدا کا جو تصور رہا ہے اسکا بہت حد تک تعین کر لیا ہے۔ مختلف سوسائٹیوں نے اپنی اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کے مطابق خدا بنا لیے تھے۔ مختلف قوموں، قبیلوں، بادشاہوں نے اپنے اپنے خداؤں کا جھنڈا بلند کر کے خونریزیاں کی ہیں۔ ایچ جی ویلز جنگ صلیب و ہلال کے متعلق لکھتے ہیں ''جون 1099ء میں عیسائیوں نے یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔ ایک مہینے کے محاصرے کے بعد دھاوا بول دیا گیا۔ خونریزی کی انتہا نہ رہی۔ گلیوں کے فرش سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر گھڑ سواروں کو بھگو رہے تھے۔ 15 جولائی کو صلیب بردار لڑتے لڑتے سپچر کے کلیسا تک بڑھ گئے اور مسلمانوں کی طرف سے تمام مدافعت ختم ہو گئی۔ کلیسا میں پہنچ کر تھکاوٹ سے چُور، خون میں لتھڑے ہوئے اور وفورِ مسرت سے روتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل گر گئے اور خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔'' ہمارے ہاں بھی اللہ کے ''متوالے'' اور ''وائے گرو'' کے سیوک اس قسم کے گل کھلا چکے ہیں۔ خود مسلمانوں میں اللہ کے تصور کے بارے میں اختلاف پر خونریزیاں ہوئی ہیں۔ معتزلہ کا قتل عام ایک ایسا ہی حادثہ تھا۔ صوفی اور ملا میں اب تک سر پھٹول ہے۔

مصنوعی سیاروں نے خدا، عرش، جنت، دوزخ اور سات آسمانوں کو کم از کم نظام شمسی سے خارج کر دیا ہے۔ کچھ لوگ ایماندارانہ خلوص کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ زمین ایک قالین کی طرح چپٹی ہے اور ستارے آسمان کی زینت ہیں، کہکشاں براق کے پاؤں کی گرد ہے، شام کو ٹوٹنے والے تارے وہ جلتے ہوئے پتھر ہیں جو اللہ اور اس کے فرشتے شیطان اور اس کے شتونگڑوں کو دور بھگانے کیلئے پھینکتے ہیں تاکہ یہ لوگ کاروبار عالم کے بارے میں دربار خداوندی کی روزمرہ کانفرنس کی کاروائی نہ سن سکیں۔ زلزلے ایک قدرتی حادثہ نہیں بلکہ بدکار شہروں کی سرزنش کے لئے لائے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کیلئے بہت مشکل کے دن آ رہے ہیں اور ان کو اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب میں جی بہت کڑا کرنا ہوگا.....

اس بارے میں میرے اپنے ذہنی خاکے کئی بار الٹے سیدھے ہوئے ہیں۔ بچپن میں میرے خدا کی شکل میرے والد سے مشابہت رکھتی تھی البتہ چہرہ کوئی دو تین گھماؤں میں پھیلا ہوتا تھا۔ جب بادل جمع ہو رہے ہوتے تھے تو اللہ میاں میری طرف دیکھ دیکھ کر اکثر مسکرایا کرتے تھے۔ میری سمجھ میں تبدیلی زندگی کے تجربہ کے ساتھ ساتھ آتی گئی تو خدا کا تصور بھی بدلتا رہا بقول غالب

ـ ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

باب نمبر 4

نو آموز

بنگلور سے میری تعیناتی سیدھی پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین میں ہوگئی یہ تھی 16 پنجاب کی ساتویں بٹالین۔ یہ ان دنوں ایبٹ آباد سے اوپر بکروال کے مقام پر کیمپ کر رہی تھی۔ یہ بات عام قاعدے کے خلاف تھی۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ کمیشن ملنے کے بعد نوجوان افسر رجمنٹل سنٹروں میں بھیجے جاتے تھے۔ جہاں ان کی ٹریننگ میں رہی سہی کسر پوری کر کے ان کو کسی رجمنٹ کی بٹالین میں بھیجا جاتا تھا۔ لیکن اگست 1942ء میں جب مجھے کمیشن ملا سرکار انگلشیہ کی حالت نازک تھی اور جنگ کی بھٹی گرم رکھنے کیلئے جو پختہ یا خام مال ان کے ہاتھ لگ رہا تھا دھڑا دھڑ جھونک رہے تھے۔

جس دن میں کیمپ میں پہنچا تو بٹالین ایک آدھ دن کیلئے باہر ٹریننگ کیلئے گئی ہوئی تھی۔ کیمپ میں صرف ایک افسر ملا۔ بلکہ نیم افسر کہنا چاہیے۔ وہ تھے بٹالین کے بنگالی میڈیکل افسر ڈاکٹر رے۔ فوج میں ڈاکٹروں کو کمیشن تو مل جاتا ہے لیکن چونکہ عام طور پر بہت کم سپاہی بلاواسطہ حکمرانی کیلئے ملتے ہیں اس لئے اُن کی حیثیت نیم افسر کی ہوتی ہے۔ کیا سپاہی اور کیا دوسرے افسر سب اُن کو کیپٹن صاحب یا میجر صاحب نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ڈاکٹر رے کو بے اندازہ خوشی ہوئی۔ اُن کی اس مسرت میں میری اپنی کسی خوبی کو کم دخل تھا۔ اس کی وجہ نئے کمیشن یافتہ ہندوستانی افسروں کی پلٹنوں میں ناگفتہ بہ حالت تھی۔ ہماری اپنی پلٹن میں بائیس تئیس افسروں میں صرف چار پانچ ہندوستانی تھے۔ باقی سب انگریز اور یہ چار پانچ بھی سب سے جونیئر۔ چنانچہ اُن کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا۔ انگریزوں کو نفرت اس لئے تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی کالا آدمی اُن کے برابر ہو بیٹھے اور اُن کی حاضری میں صاحب بہادر کہلائے اور انگریزی کھیر کی کھچڑی بنا ڈالے۔ غصہ اس لئے تھا کہ ہمیں مجبوراً لے رہے تھے۔ حقارت اس لئے تھی کہ اکثر ہندوستانی افسر کپلنگ کے گنگا دین کی قسم کے تھے۔ ان حالات میں جب بھی موقع ملتا تھا انگریز

ہمیں ٹھوکر لگانے سے نہیں چوکتے تھے۔

انگریزوں سے زیادہ ہماری مخالفت ہمارے اپنے لوگوں کی طرف سے ہو رہی تھی۔ یہ تھے بٹالین کے صوبیدار (جمعدار) جن کو سردار کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ پُرانے وقتوں کی یادگار تھے جبکہ فوجیں قبائل پر مشتمل ہوتی تھیں۔ قبیلے کا سردار میدانِ جنگ میں بھی اپنے قبیلے کی سرداری کرتا تھا۔ بعد میں یہی کام جاگیردار کرنے لگے تھے۔ ہر جاگیردار کا فرض تھا کہ وہ اپنے کسانوں میں سے ایک خاص تعداد تیار رکھے۔ جب بھی سرکار کی طرف سے حکم ملے ان کو لے کر کسی مقررہ جگہ حاضر ہو جائے۔ ہر قبیلے یا جاگیردار کی طرف سے آئے ہوئے سپاہیوں کو احکام اُن کے سرداروں کے ذریعے پہنچائے جاتے تھے۔ انگریزوں نے حسبِ معمول نئی اور پُرانی باتوں کو ملا کر ایک نئی صورت پیدا کر لی تھی۔ نئی فوجوں کی ٹریننگ اتنی وسیع اور مخصوص انداز کی ہو گئی تھی کہ ایک ہی آدمی کے لئے ایک ہی وقت میں کھیتی باڑی یا گلہ بانی کرنا اور سپاہی بننا مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ انگریز نے جاگیرداروں پر انحصار کرنے کی بجائے فوج کی بھرتی، اُس کی ٹریننگ، تنخواہ اور رسد کا کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ پُرانے سسٹم میں اپنے مطلب کے پہلو مناسب ترمیم کے ساتھ قائم رکھے تھے۔ مثلاً ہندوستان کے لوگوں کو اُن کے ہزاروں قبیلوں کی بجائے اپنی مرضی کے ساخت کردہ درجن بھر قبیلوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پنجابی، مسلمان، گورکھے، سکھ، مرہٹے، ڈوگرے، پٹھان، گڑھوالی، مدراسی، راجپوت، جاٹ، رانگھڑ، بنگالی، بہاری، بلوچی وغیرہ۔ ہر رجمنٹ کو (ماسوا گورکھا رجمنٹوں اور دوسری مخصوص پلٹنوں کے) اِن تین یا چار قبائلی گرہوں پر مشتمل کیا جاتا تھا۔ رجمنٹ کے اندر کچھ اِس قسم کا انتظام تھا کہ یہ طبقے اکٹھے رہتے ہوئے بھی جُدا جُدا رہیں۔ ایک دُوسرے کے خلاف توازن بھی قائم رکھیں۔ انگریز کی خدمت میں ایک دُوسرے کا بڑھ چڑھ کر مقابلہ بھی کریں۔ میری اپنی بٹالین میں پچاس فیصدی پنجابی مسلمان، پچیس فیصدی سکھ اور پچیس فیصدی ڈوگرے تھے۔ اِن کی علیحدہ علیحدہ کمپنیاں تھیں۔ دو مسلمان، ایک سکھ اور ایک ڈوگرہ ہیڈ کوارٹر کمپنی اِسی تناسب سے مخلوط تھی لیکن ان کی پلاٹونیں اور سیکشن اپنی اپنی قوم کے حساب سے منقسم تھے یعنی غیر مخلوط۔ ہر بٹالین اور رجمنٹ میں عہدوں کی تقسیم آبادی کے تناسب سے تھی۔ ایک قوم میں پیدا ہونے والی آسامی اسی قوم کے کسی آدمی کے ذریعے پُر کی جاتی تھی۔

صوبیدار (جمعدار) پرانے جاگیردار سرداروں کا عکس تھے اور اس نسبت سے سردار کہلاتے تھے۔ لیکن ان کی حیثیت اور کام کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اب ان میں معدودے چند براہِ راست سردار

بھرتی کئے جاتے تھے۔ اُن کی بھاری اکثریت کو سپاہی بھرتی ہو کر ترقی کرنی ہوتی تھی۔ سزا جزا سب انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ صوبیداروں (جمعداروں) کا کام تھا کہ سپاہیوں کے ساتھ رہیں اُن کی خوشی غمی کو انگریزوں تک پہنچاتے رہیں اور لڑائی یا امن میں اپنے اپنے دستوں کی کمان کریں۔ انگریز کا قاعدہ تھا کہ جس بات میں اِس کے اپنے یا اس کی قوم کے مفاد کو دخل ہوتا تھا اس میں صرف اپنی مرضی چلنے دیتا تھا۔ باقی کے جھگڑے جھمیلے سرداروں پر چھوڑ دیتا تھا اور کچھ اس طرح کا دستور چل نکلا تھا کہ سپاہیوں کی نظر میں ہر نیکی انگریز کی طرف سے تھی اور ہر بدی سرداروں کی طرف سے۔

سرداروں کا وقار اس پر قائم تھا کہ اُن کی انگریز تک رسائی تھی جس کے نتیجے میں اُن کی سفارش چل جاتی تھی۔ دیسی افسروں کے آنے پر بھگدڑ مچ گئی۔ جب نیا انگریز افسر آتا تھا تو اس کے جمعدار (صوبیدار) اس کے ساتھ اپنے بھتیجے کا سا سلوک کرتے تھے کہ "صاحب یوں نہیں یوں۔ ہندوستان میں ایسا ہوتا ہے ایسا نہیں"۔ "آج سے بیس سال پہلے فلاں صاحب بہادر نے ایسے موقع پر یوں کیا تھا۔ فلاں آدمی قابلِ اعتبار نہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔ نئے انگریز افسروں کو اُردو بھی کم ہی آتی تھی لیکن پنجابی تو سرے سے جانتے ہی نہ تھے اور سردار صاحبان اُن کے لئے ترجمان کا کام کرتے تھے۔ پلٹنوں میں بڑے بڑے دلچسپ قصے مشہور ہیں کہ کس طرح سرداروں نے ترجمہ ترجمہ میں ہی سیدھے کو اُلٹا اور اُلٹے کو سیدھا کر دکھایا۔ مثلاً ایک سپاہی دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر صوبیدار کے خلاف دادِ فریاد کیلئے دہائی دے رہا تھا۔ صاحب نے صوبیدار سے پوچھا کہ صوبیدار صاحب یہ آدمی کیا مانگتا ہے اور صوبیدار نے کہہ دیا حضور یہ آپ سے خوش ہو کر آپ کو اور سرکار عالیہ کو دُعائیں دے رہا ہے۔ ہندوستانی افسروں کو نہ ترجمان کی ضرورت تھی اور نہ یہ جاننے کی کہ ہندوستانی لوگوں کی طبیعت کیسی ہوتی ہے۔ اُن کے سامنے اُن کے باپ دادا پردادا کا حوالہ بھی نہیں دیا جا سکتا تھا کہ جن کے ساتھ سردار نے خود یا اُس کے باپ دادا، پردادا نے نوکری کی ہو۔ ہندوستانی افسر بیشتر ایسے تھے جو اپنے خاندان میں پہلے افسر بنے تھے۔ الغرض ہندوستانی افسروں کے آنے سے سرداروں کا بازار مندا پڑنے لگا جس کا ان کو رنج تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جو اس تضاد میں اضافے کا موجب تھیں۔

جس وقت میں پلٹن میں پہنچا ہوں اس وقت یہ چپقلش بہت واضح تھی۔ اس میں ہندوستانی افسروں کا بھی قصور تھا۔ بعض کی عادت تھی کہ اپنے ماتحت صوبیداروں (جمعداروں) کو خاطر میں

نہ لاتے تھے اور براہِ راست سپاہیوں تک رسائی کر لیتے تھے۔ اس طرح ان کے اپنے سرداروں کا رعب داب، اِن سرداروں کی نسبت جو کسی انگریز افسر کے ماتحت تھے اور جن کی بیچوں بیچ والی پوزیشن قائم تھی، کم ہو جاتا تھا۔ انگریز افسروں کے ماتحت سرداروں کی پوزیشن میں چونکہ ہندوستانی افسروں نے کمزوری پیدا کر دی تھی اس لئے وہ ان کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں ان کو انگریز افسروں کی حمایت حاصل تھی۔ انگریز بیچاروں کا بھی قصور نہیں تھا۔ اُن کو ہر وقت خدشہ رہتا تھا کہ کہیں دیسی سپاہی بدیسی افسروں کی بجائے دیسی افسروں کو پسند کرنا شروع نہ کر دیں۔ غیر قوم پر حکمرانی پلک جھپکنے میں کانٹوں کا تاج بن سکتی ہے۔ دیسی افسروں کا بہت بڑا قصور اِن کا رنگ بھی تھا۔ لوگ گورے رنگ کے عادی ہو چکے تھے اور اِسے حاکمیت کی نشانی جانتے تھے۔ ایک صوبیدار میجر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ انگریز کو (سپاہی ہو یا جرنیل) ملکہ کا پوترا سمجھ کر بلا تمیز سلوٹ کر دیا کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ ماننا کہ ہندوستانی بھی افسر بن سکتے ہیں دشوار تھا۔

اِن دنوں ہماری بٹالین میں افسروں کی بھرمار تھی۔ کُل تیئس (23) تھے جن میں پانچ انڈین تھے۔ رُتبہ کے لحاظ سے تیئسواں مَیں تھا۔ اُس وقت ذمہ داری کے عہدے صرف پندرہ تھے۔ اس لئے باقی افسروں کو سینئر افسروں کے ماتحت شاگرد پیشہ ہونا پڑتا تھا۔ مجھے کیپٹن مارگن کی ماتحتی میں اُس کا کمپنی افسر لگا دیا گیا۔ اس کا ایک اور کمپنی افسر بھی تھا، یہ صاحب ہندوستانی تھا اور مجھ سے کوئی چھ مہینے سینئر۔ تو گویا مارگن کی کمپنی میں میرا نمبر تیسرا تھا۔ اتوار کے اتوار پلٹن کے مہتروں کا گرجا بھی کرتے تھے۔ ہندوستان میں جے پلے تھے اس لئے ہندوستانیوں کو عام انگریز قاعدے کے مطابق متکبرانہ التفات کی بجائے مساویانہ خشونت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

مجھ نو گرفتار کی یہ حالت تھی کہ بٹالین میں پہنچنے پر اتنا بھی پتا نہیں تھا کہ صوبیدار میجر کس بلا کا نام ہوتا ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اِتنی اہمیت کے عہدیدار کے بارے میں بنگلور میں پڑھایا نہ گیا ہو۔ لیکن کسی طرح سے میرے ذہن کی دہلیز سے کھسک گیا تھا۔ دوسری بات جس سے مجھے بہت پریشانی ہوئی وہ تھے پنجابی مسلمان۔ یہ لوگ زیادہ تر دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیانی علاقے کے رہنے والے تھے اور میں اِن کے پنجابی لہجہ سے غیر مانوس تھا۔ چنانچہ شروع شروع میں مجھے اُن کا لہجہ سمجھنے میں بہت دِقت پیش آئی۔ میرے اور اِن کے درمیان ایک دیوار سی حائل رہی جو کئی سالوں بعد جا کر ٹوٹی۔ ڈوگروں کو بھی اُس وقت میں کسی خاص پسندیدگی کی نِگاہ سے نہیں

دیکھتا تھا۔ اُن میں سے بہت سوں کی شکلیں گاؤں کے بنیئے سے ملتی تھیں۔ جب لڑائی میں مجھے اُن کی کمان کا موقع ملا تو سب ذات پات ٹوٹ گئی اور محبت کی روشنی نے سب روایتی کدورتیں دور کر دیں۔ باقی رہے سکھ تو یہ میرے اپنے علاقے کے تھے۔ اُنہوں نے فوراً مجھے اپنا گرائیں (ہم وطن) ہونے کا اعلان کر دیا۔ ایک اور بات جس کا مجھے علم نہیں تھا وہ قوموں کی اندرونی گروہ بندی تھی۔ پنجابی مسلمانوں میں راولپنڈی، جہلم، گجرات، شاہ پور، کیمبل پور وغیرہ کے ضلع وار دھڑے تھے جن کی جنگ مسلسل جاری رہتی تھی۔ کبھی ترقی پر جھگڑا تھا کبھی تبدیلی پر اور کبھی عہدوں کی تقسیم پر۔ اسی طرح ڈوگروں میں کانگڑہ، ہوشیار پور اور جموں کے گروپ تھے اور سکھوں میں ماجھا مالوہ کے۔ اِس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا جب بٹالین پہنچنے کے چند روز بعد میں نے دیکھا کہ ہر روز شام کو میرے خیمے کے باہر پندرہ بیس سپاہیوں کا ایک گروہ جمع ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ میرے اردلی حیدر علی کے ساتھ حقّے کا شغل فرماتے تھے۔ جب کبھی میرا اِدھر سے گزر ہوتا تو اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور کچھ اس طرح میری طرف دیکھتے کہ اُن کی آنکھوں سے مادرانہ شفقت بھی ٹپکتی تھی اور فرزندی کے آداب و نیاز بھی۔ میرے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب مشرقی پنجاب کے مسلمان تھے چونکہ معدودے چند تھے اس لئے میرا سہارا ڈھونڈنے کے لیے میرے خیمے کے باہر جمع ہو جاتے تھے۔ تاہم فوج میں آہستہ آہستہ اِس رسم کا خاتمہ ہو گیا۔

میرے ساتھی کمپنی افسر صاحب نے بڑے بھائی کی حیثیت سے میری تربیت کا بیڑا مجھ سے دریافت کئے بغیر ہی اُٹھا لیا اور پہلے ہی دن ایک لیکچر پلا دیا کہ مجھے بطور نا آموز کے کیا کچھ کرنا چاہئے اور کیا کچھ نہیں کرنا چاہئے۔ موٹی موٹی نصیحتیں یہ تھیں:

کرنل سے بحث مت کرو۔ وہ بحث لمبی کر دیتا ہے اور تم سے جواب بن نہ پڑے تو ناراض ہو جاتا ہے۔ تمہاری ساڑھے اِکیس سال عمر ہے اور اُس کی تیئس سال ہندوستانی فوج میں نوکری۔ ظاہر ہے بحث میں تمہاری ہار اور نتیجتاً کرنل کی ناراضگی لازمی ہے۔ صوبیدار میجر بہت طاقتور آدمی ہے اس سے ڈرو۔ کرنل اس کی سب باتیں مانتا ہے اور ہندوستانی افسروں کے بارے میں اس کا حرف آخری ہوتا ہے۔ بہتر ہے آج شام ہی اس سے ملو۔ میں نے پوچھا وہ عہدے میں مجھ سے بڑا ہے یا چھوٹا۔ فرمانے لگے عہدے کو چھوڑو، وہ پوزیشن میں دس لیفٹیننٹوں کے برابر ہے۔

سرداروں سے کُھل کر بات مت کرو۔ کمینے لوگ ہیں۔ دوستی کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہمیں ذلیل کرتے ہیں۔ میری عزت کرو میں تم سے چھ مہینے سینئر ہوں۔ جب بھی وردی میں ملو سلوٹ کرو۔

میں نے کہا کہ فلاں انگریز بھی تو تم سے جونیئر ہے لیکن وہ سلوٹ تو ایک طرف تمہیں خاطر میں بھی نہیں لاتا۔ فرمایا تم تو انگریز نہیں ہو۔ یہاں انگریز کی تو اپنی فوج ہے۔ ہم تم کیا ہیں؟

میں نے اپنے ناصح کی طرف دیکھا اور سوچا کہ یہ شخص جو اتنی فراخدلی سے اپنے تجربوں کا نچوڑ بغیر فیس لئے مجھے پیش کر رہا ہے، بہت اچھا آدمی ہے مگر دیکھوں تو سہی یہ خود اس راہ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ انگریزی میں ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم یہ ہے ''کسی کھانے کا جائزہ اس کے نام یا ترکیب یا شکل سے نہیں بلکہ اس کے مزے سے لیا جاتا ہے''۔ میں نے دیکھا کہ کرنل صاحب کو دیکھتے ہی ان صاحب کا رنگ فق ہو جاتا تھا اور کرنل صاحب کے تیور بھی ایک لمحہ کے لئے چڑھ جاتے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ میرے مشفق کی انگریزی کمزور تھی۔ آپ ایک امیر گھرانے کے غریب رشتہ دار تھے۔ اس لئے سارا اثاثہ ٹھاٹھ باٹھ پر خرچ ہو گیا تھا اور تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ چنانچہ جب کبھی کرنل سے مڈھ بھیڑ ہوتی تھی ان کی انگریزی ختم ہو جاتی تھی اور لازماً کرنل کا غصہ بڑھ جاتا تھا۔ جس سے ان صاحب نے کامیابی کا پہلا اصول گھڑ لیا تھا کہ کرنل سے بحث مت کرو۔

صوبیدار میجر صاحب سے کچھ دن میں جان بوجھ کر نہ ملا۔ اس کے بعد وہ ڈیڑھ ماہ کی رخصت پر چلے گئے واپس آئے تو بھی میں اپنے مربیؔ کے اصرار کے باوجود ان سے ملنے نہ گیا۔ اُلٹا اُن کو ایک دن افطاری پر بلا لیا۔ (رمضان شروع ہو چکا تھا) بہت نیک انسان تھے اور میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ فوج نے جو مجھے چند ایک عزیز دوست دیئے ہیں صوبیدار میجر صاحب ان میں سے ایک تھے۔ اِس سے پہلے میں کامیابی کا پہلا اصول بھی توڑ چکا تھا یعنی ایک مسئلہ پر (جس کے متعلق میں نے جنرل ہیڈ کوارٹر کی تازہ ترین ہدایات پڑھ لی تھیں لیکن کہیں کرنل صاحب عدیم الفرصتی کی وجہ سے ابھی تک نہیں پڑھ سکے تھے) گرما گرم بحث کر ڈالی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کرنل صاحب کا منظورِ نظر بن گیا اور اُس نے مجھے بٹالین کا انٹیلی جنس افسر بنا دیا تھا۔

دو پرہیزوں کا مزہ توڑنے کے بعد میں تیسرے کی طرف ہوا۔ یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار صاحبان اپنے افسروں سے نفرت اور غیروں کی عزت کیوں کر رہے ہیں۔ کافی مین میخ نکالنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ اِس کی وجہ اِن کے وقار کو خطرہ تھا جو نئی صورتحال نے پیدا کر دیا تھا۔ اِس کا حل میں نے یہ نکالا کہ ہر سردار کی انگریزوں سے زیادہ عزت کرتا تھا لیکن اگر پھر بھی وہ ہندوستانی افسروں کے ساتھ بے رخی پر مُصر رہتا تو اِس کا خیال چھوڑ دیتا۔ مجھے خوشی ہے کہ ساری

نوکری میں سوائے ایک دو معمولی جھڑپوں کے میری کسی سردار سے لڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ یوں سردار انگریزوں سے زیادہ میری عزت کرتے رہے ہیں۔ اِس سے اس طبقہ کی جبلّی شرافت اور حالات کے ہاتھوں مجبوری دونوں بہت واضح ہو جاتے ہیں۔

ایک دن باتوں باتوں میں مَیں نے اپنے مربیؔ سے ان کے اصولوں کا ذکر کیا۔ فرمانے لگے بھئی اصول اپنی جگہ قائم ہیں ہم تو ان کا کھوج نکالتے نکالتے شہید ہو گئے ہیں۔ تم بغیر لاگت لگائے سود مند رہے ہو۔ اپنے اپنے نصیب ہیں۔

1942ء میں ہندوستانی فوج کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ ہانگ کانگ، ملایا، سنگاپور، برما میں پے در پے شکستوں نے اس کو تہس نہس کر دیا تھا۔ مادی نقصان کا اندازہ کر کے آدمی لڑکھڑا جاتا تھا لیکن اِس سے بھی بڑا نقصان ذہنی انتشار تھا۔ فوج کے کمانڈر اس انتشار کا شکار ہو گئے تھے۔ اِن کو جاپانی طرزِ جنگ کا رَدّ نہیں مل رہا تھا اور وہ طرح طرح کی ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ اس کا اثر سب پر ہو رہا تھا اور ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

عرصہ سے ہماری فوج کا مکتب ہندوستان کا شمال مغربی سرحدی علاقہ رہا تھا۔ یہیں جنگ کے نئے طریقے اور ہتھیار ٹیسٹ کئے جاتے تھے۔ یہیں انفرادی اور اجتماعی بہادری کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ سالہا سال کی مشق کے بعد سرحدی لڑائی کے طور طریقے، نظم و نسق اور ماحول ہندوستانی فوج کے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے۔ جب جاپانیوں سے واسطہ پڑا تو اُس کی وہی کچھ حالت ہوئی جو عرب کے بدو کی منطقہ باردہ شمالی میں اور ایک اسکیمو کی صحرائے عرب میں ہو سکتی ہے۔ بس انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے اور شیرازہ منتشر ہو گیا۔

شمال مغربی سرحد کا چپہ چپہ ہندوستانی فوج نے چھان مارا تھا۔ ایک ایک ٹیلے پر کئی کئی بار چڑھنے اور اُترنے کی مشق ہو چکی تھی۔ فوج ہمیشہ ایک تیار کیمپ سے دوسرے تیار کیمپ تک حرکت کرتی تھی۔ بار برداری خچروں سے ہوتی تھی اور جنگ کی نقل و حرکت بھی خچروں کی رفتار اور پہنچ پر منحصر ہو گئی تھی۔ سارے علاقے میں انگریزی ایجنٹوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان کے ذریعے لمحہ لمحہ کی خبریں کمانڈروں تک پہنچتی رہتی تھیں اور خطرے کے مقابلے کے لئے اُن کو اتنا وقت مل جاتا تھا کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ اُن کو آہستہ آہستہ سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ طرفین کا مقابلہ کچھ اس قسم کا تھا کہ قبائل کی ایک گولی کے مقابلے میں ہوائی جہازوں، توپوں، مشین گنوں، مارٹروں اور رائفلوں کی باہا کار مچ جاتی تھی۔ قبائلیوں کے پاس رائفل سے بڑا ہتھیار نہیں تھا مگر فوج نے سمجھ لیا تھا کہ اس

کے سب دشمن اسی طور سے مسلح ہوں گے اور اگر نہیں ہوں گے تو یہ کرکٹ کا کھیل نہیں ہو گا زیادتی ہو گی۔ قبائلی اپنے گھروں اور بستیوں کے اردگرد کے پہاڑوں ہی میں لڑتے تھے اور دن کو لڑائی کر کے رات کے وقت اپنے بال بچوں کے پاس آ رہتے تھے۔ چنانچہ ہندوستانی فوج کی نقل و حرکت چند میل کے اندر محدود رہتی تھی اور یہ اُس کی عادت ہو گئی تھی۔ بہت کم موقعوں پر دشمن کے عمل کی وجہ سے اس کی رسد کا دھارا ٹوٹا تھا اور بہت کم موقعوں پر اسے ایک سے زیادہ سمت منہ کر کے لڑنا پڑتا تھا۔ فرنٹیر کی لڑائیاں اتنے چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھیں کہ فوج کو بڑے بڑے گروپوں میں جنگ کرنے کے مواقع بہت کم پیش آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ صرف بٹالینوں اور بریگیڈوں کو ہی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع نہیں ملا بلکہ بڑے بڑے کمانڈروں کو بڑے پیمانے پر سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اِن باتوں کے علاوہ فرنٹیر کے لق و دق علاقے میں مقامی طور پر فوج کو بہت کم رسد کا سامان مہیا ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیاء میں انڈین فوج ایک غیر مُلک کی فوج تھی اور مقامی باشندوں کے ساتھ اس کی راہ و رسم معیوب سمجھی جاتی تھی۔ فوج کو مقامی طور پر رسد جمع کرنے میں ہچکچاہٹ تھی۔ اس پس منظر کے ساتھ جب جنوب مشرقی ایشیا کے زرخیز علاقوں میں انہیں لڑنا پڑا تو یہ عادت قائم رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ پاؤں تڑوا کر بیٹھ گئی۔ ایسی فوج کو جاپان کی فوج نگل نہ جاتی تو اور کیا ہوتا۔ سب سے پہلی پریشانی فوج کو یہ ہوئی کہ دشمن اُس کے مقابلے کے ہتھیاروں سے لیس تھا۔ بہت دفعہ ایسا ہوا کہ ہندوستانی دستے فرنٹیر کی عادت سے مجبور ہو کر دشمن کی ایک گولی کے مقابلے میں دس گولیاں چلاتے رہتے اور اس طرح سارا دارو سلہ پھونک بیٹھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ تازہ گولہ بارود پہنچنے سے پہلے ہی جاپانی حملہ کر کے انہیں بھسم کر دیتے تھے۔ جاپانی فوج قبائلیوں کے مقابلے میں بہت چلتا پرزہ تھی۔ آج یہاں مقابلے میں ہے کل بیس میل کہیں اور نکل گئی جبکہ پرسوں چالیس میل اور بھی پرے۔ حتیٰ کہ ہندوستانی فوج ڈِک ہو کر بھاگ اُٹھتی اور برف کے لڑھکتے ہوئے گولے کی طرح راستے میں بیٹھی ہوئی باقی کی فوج کو بھی ساتھ ملا لیتی۔ جاپانی رات کے وقت حملہ کرتے تھے اور ہندوستانی فوج کو رات کے وقت پکیٹس لگا کر کیمپ کرنے کی عادت تھی۔ رات اور پھر جنگل کی رات یوں بلبلا اُٹھتی جیسے ایک بچہ سوتے میں ڈر جائے۔ فرنٹیر کے علاقے اور جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلی علاقے میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہاں ایک آدمی حرکت کرے تو میلوں سے نظر آ جاتا ہے اور وہاں سو گز کے فاصلے سے پوری فوج گزر جائے اور کسی کو خبر نہ ہو۔

نئی صورتحال سے نپٹنے کے لئے نئے نئے طریقے سوچ رہے تھے۔ آج ایک حُکم آتا تھا کل دوسرا۔ پلٹنوں کو تجربے کرنے کے لئے کہا جاتا تھا اور اس کے نتیجے مانگے جاتے تھے۔ فوج کی ترکیب، نظم و نسق، رسد، ہتھیار، طرز جنگ سب کو پگھلایا جاتا تھا۔ پھر بنایا جاتا تھا۔ پھر پگھلایا جاتا تھا کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ جس سے جاپانیوں کو نیچا دکھایا جا سکے یا کم از کم اُن کی یلغار کو روکا جا سکے۔

برٹش انڈین فوج کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ جاپانی فوج کی نسبت پچیس سال پُرانی تھی۔ اِس پچیس سال کی دقیانوسیت نے اس پر قہر نازل کر دیا تھا۔ جب سے انگریز قوم کے خداوندانِ اقتدار کو اِس کا احساس ہوا تھا تو وہ اس عرصے کو پاٹنے کے لئے سر توڑ کوششیں کر رہے تھے۔ لیکن ان کو طرح طرح کی مشکلیں پیش آ رہی تھیں۔ یہ مشکلیں وہی تھیں جو ہر نظامِ کہنہ کو بدلنے میں پیش آتی ہیں۔ تانگے والا بسوں کی مخالفت کر رہا ہے۔ ریل والے ہوائی جہاز کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مذہبی پیشوا سائنسدانوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ کارخانے والے کو نئی مشینیں لگوانے سے پہلے پرانی مشین سے پیچھا چھڑانا ہوتا ہے۔ انگریزی پڑھے لکھے اُردو کی ترویج کی مخالفت کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا اقتدار کے چبوترے پر بیٹھنے کا پشتینی پیشہ ہوتا ہے وہ ہر نئی قوت کے مقابلے میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ہر نئی چیز کی مخالفت کے پردے میں انسانی خود غرضی، نالائقی یا عادت کارفرما ہوتی ہے۔ ہمارے کرنل صاحب زمان و مکان سے عدم مطابقت کی واضح مثال تھے۔ ان کی ملازمت تیئیس سال تھی۔ یہ سارا وقت انہوں نے ہندوستانی پلٹنوں کے ساتھ گزارا تھا۔ پنجاب کے چپہ چپہ سے واقف تھے۔ پنجابی مسلمان، سکھ یا ڈوگرہ کی شکل دیکھ کر عموماً کہہ سکتے تھے کہ یہ موصوف کِس ضلع، کِس تحصیل یا کِس علاقہ کا باشندہ ہے۔ اس کے علاوہ فوج کے آداب و رسوم سے بہت واقف تھے۔ بہت سختی سے ان پر عملدر آمد کرتے اور کرواتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ ہم چوبیس گھنٹے کی مسلسل مارچ کے بعد ایک کیمپ میں اترے۔ مَیں صوبیدار میجر سے گفتگو کر رہا تھا کہ پلٹن کا ایک نائی ان کی داڑھی مونڈنے آ گیا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ پہلے میں منڈوا لوں۔ داڑھی کافی بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے منڈوالی۔ کرنل کہیں دُور سے یہ کاروائی دیکھ رہا تھا۔ موقع پا کر مجھے بلوایا۔ کہنے لگا کہ دیکھو میاں صاحبزادے میری تیئیس سال کی نوکری ہو گئی ہے اور ایک دفعہ بھی نائی سے شیو نہیں کروایا اور تم چار مہینے کی نوکری میں ہی اِن کرتوتوں پر اُتر آئے۔ میں نے مناسب اظہارِ ندامت کیا اور چلا آیا۔ کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بول چال اور

دوسرے اِس قسم کے آدابِ محفل کے مطابق کرنل صاحب بہت مستعدی برتتے تھے۔ لیکن جہاں تک میدانِ جنگ میں فوج کی نقل و حرکت اور لڑائی کے داؤ پیچ کا تعلق تھا تو وہاں معاملہ دوسرا تھا۔ ہم حیران ہوا کرتے تھے کہ کرنل صاحب نے تیئس سال کے عرصے میں اتنا کم سیکھنے کا کیونکر بندوبست کر لیا تھا۔ وہ تو بالکل لکیر کے فقیر تھے۔ وہ ہر نئی بات کو توڑ مروڑ کر اپنی دقیانوسیت کے سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔ اِن کے ذہن میں فرنٹیئر کی جھڑپوں کے علاوہ جنگ کا تصور موجود ہی نہیں تھا۔ حکامِ اعلیٰ کی طرف سے جنگ کیلئے نئے نئے طریقوں سے متعلق ہدایات آتی تھیں اور اِن دنوں ایسی ہدایات کی بھرمار بھی تھی۔ یہ ہدایات جب کرنل کے ذہنی سانچے سے گزرتی تھیں تو اُن کی کیفیت کچھ اس قسم کی ہو جاتی تھی۔ ان کا غافل (inalert) ذہن یہ سوچنے لگتا تھا کہ جنرل ہیڈکوارٹر والے پُرانی باتوں کو نئے الفاظ اور ترکیبوں میں کیوں بیان کر رہے ہیں۔ اس طرح اپنا اور ہمارا سب کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہم بہت پیٹتے تھے کہ حضور مقابلہ جاپانیوں سے ہے قبائلیوں سے نہیں ہے لیکن کرنل صاحب کے آگے کون دم مار سکتا تھا۔

فوج کا بندوبست ایک اور بڑی سر دردی تھی۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ سپاہی ایک وقت کا کھانا کھا کر چل پڑتا تھا اور ایک وقت کا کھانا اُس کے جھولے میں ہوتا تھا۔ پانی کی بوتل ساتھ ہوتی تھی۔ مزید پانی عموماً دورانِ سفر میسر آ جاتا تھا۔ اِس طرح ایک سپاہی چوبیس گھنٹے کے لئے رسد سے بے نیاز ہو جاتا تھا۔ سرحد کی لڑائی میں اِس سے زیادہ آزادی کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ لیکن جاپانیوں کے ساتھ لڑائی میں نہایت شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک لڑاکے، کیا افسر، کیا سپاہی کے پاس تین دن کا گولہ بارود، روٹی پانی ہو۔ یہ ایک بہت بڑی اُلجھن تھی اور ہندوستانی فوج کے لئے بالکل نئی بات۔ مختصراً مسئلہ یہ تھا کہ سپاہی کو اتنا بھی نہ لادا جائے کہ وہ تھکاوٹ یا بے ڈھب بوجھ کی وجہ سے لڑائی کے قابل ہی نہ رہے اور وہ اتنا کچھ اُٹھا بھی لے کہ دو تین دن کے لئے سپلائی سے آزاد ہو جائے۔ اِس مسئلے کے حل میں دو مشکلیں پیش آ رہی تھیں۔ ایک تو یہ تھی کہ ہندوستانی فوج کے پاس اس مقصد کے لئے مناسب سامان نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ یہ فیصلہ بڑا مشکل تھا کہ کون سی چیز اُٹھائی جائے اور کون سی چھوڑی جائے۔

مشین گنیں، رائفلیں، سنگینیں، بیلچے، سٹریچر، بوٹ، کمبل، موم جامے سب بھدّے اور بھاری بھرکم تھے۔ مضبوطی اور پائیداری لانے کے لئے بہت کُھلے دل سے لوہے کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ بھی جمود تھا جو فوج کے ہر شعبے پر چھایا ہوا تھا۔ سب محکموں کو ہدایتیں تھیں کہ جو چیز بھی بنے

سالہا سال کی لئے کام آ سکے۔ 1942ء کے اختتام اور 1943ء کے آغاز میں فوج کے اربابِ اختیار ابھی تک حواس باختہ تھے اور سامانِ جنگ، وقت اور مقام کے تقاضوں کے مطابق بننا شروع نہیں ہوا تھا۔ بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دنوں فوجی سامان ہمیں مل نہیں رہا تھا۔

یہ مشکل تو سرکار کی طرف سے تھی اور چونکہ اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں آتی تھی اس لئے اتنی تکلیف دہ نہیں تھی۔ البتہ دوسری مشکل زیادہ بڑی سر درد تھی یعنی موجودہ سامان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا کہ کون سا سامان اُٹھایا جائے اور کون سا چھوڑا جائے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ ہر بٹالین پر چھوڑ دیا جائے کہ جو سامان چاہیں اُٹھا لیں اور جو چاہیں چھوڑ دیں۔ ہوتا تو یہ تھا کہ اوپر سے پوچھا جاتا تھا کہ ایک خاص قسم کے حالات میں (جن کا ذکر تفصیل سے ہوتا تھا) کون کون سا سامان اُٹھانے کی سفارش کرتے ہو اور کیوں؟ فیصلہ کرنے سے پہلے تجربہ کے مطابق ہدایات موصول ہوتی تھیں۔ جب کبھی اس قسم کی کوئی ہدایت آتی تھی تو بٹالین ایک طرح کی مجلسِ مباحثہ بن جاتی تھی۔ مسئلہ زیرِ بحث افسروں سے لے کر سپاہیوں تک ہر سطح پر پیش ہوتا تھا۔ وجوہات پیش کی جاتی تھیں۔ سامان کا مختلف صورتوں میں گٹھ جوڑ ہوتا تھا۔ آخر میں افسروں کی ایک کانفرنس ہوتی تھی جس میں سب سفارشوں پر باری باری غور ہوتا تھا اور کسی ایک فیصلے پر پہنچا جاتا تھا۔ دوسرے یا تیسرے دن ساری کی ساری بٹالین فیصلہ شدہ صورت کو تجربہ کی بھٹی پر چڑھانے کے لئے نکل کھڑی ہوتی تھی۔ اس طرح جو خامیاں ظاہر ہوتی تھیں اُن کو دور کر کے سفارش کی جاتی تھی کہ فلاں صورت اختیار کی جائے۔ جس طرح ہم کر رہے تھے اس طرح فوج کی باقی بٹالین بھی کر رہی تھیں۔ جنرل ہیڈکوارٹر میں ان سب نتیجوں کا عرق نکالا جاتا تھا اور اس طرح بتدریج نئے حالات سے نبٹنے کے لئے فوج کی سپلائی تیار ہو رہی تھی۔ اس مسئلے کا حل نکالنے کے لئے پہلا کام ضرورت کے لحاظ سے سامان کی ترجیحی ترتیب تھی۔ ہتھیار اور ان کا ایمونیشن (گولیاں گولے) لباس، خوراک، دوائیاں وغیرہ یہاں تک تو معاملہ صاف تھا۔ حل طلب مشکلیں یہ تھیں کہ ہتھیار کون کون سے اُٹھائے جائیں اور اُن کے ساتھ گولہ بارود کتنا ہو؟ لباس میں کون کون سی اشیاء شامل کی جائیں؟ خوراک کیا ہو؟ پکی ہو یا کچی حالت میں ہو؟ کس مقدار میں ہو؟ دوائیاں کون کون سی آدمی خود اپنے پاس رکھے اور کون سی اس کے علاوہ بٹالین کے ساتھ ہوں؟ ہر ایک ہتھیار گولی گولہ اور اُن کے ڈبوں کے علاوہ بوٹ جرابیں، قمیض، ٹوپی، مرمت کیلئے سوئی دھاگہ روٹیاں، دال، بسکٹ، روٹی ڈالنے کے لئے برتن، کونین کی گولیاں، مچھر کا تیل وغیرہ وغیرہ۔ ایک ایک چیز کا وزن کیا جاتا

تھا۔ایک چیز کاٹی جاتی تھی اور دوسری بڑھائی جاتی تھی۔ پھر دوسری کاٹ دی جاتی تھی اور پہلی قائم رہتی تھی۔ ہتھیاروں کا لباس کے ساتھ جھگڑا تھا۔ لباس کا دوائیوں کے ساتھ۔ دوائیوں کا ہتھیاروں کے ساتھ۔ ہتھیاروں کا ایمونیشن کے ساتھ اور خوراک کا سب کے ساتھ۔ کس کو اُٹھایا جائے کس کو چھوڑا جائے۔

میں ایسی بال کی کھال اُتارنے کا عادی نہیں تھا۔ بعض دفعہ تو میں گھبرا اُٹھتا تھا کہ یا الٰہی کس جھمیلے میں پھنس گیا ہوں، میں تو یہاں افسری کرنے آیا تھا۔ اِن لوگوں نے مجھے بنیے کی دکان پر لا بٹھایا ہے۔ کبھی کبھی مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آ جاتا جب جنگ ایک سیدھا سادا طاقت اور بہادری کا مقابلہ ہوتا تھا۔ داؤ پیچ ہوتے تھے لیکن ان میں تولوں ماشوں کو دخل نہیں ہوتا تھا۔ کئی بار دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ کاش وہی حالات پھر عود کر آئیں اور میں کچھ اِس طرح رجز پڑھتا ہوا میدان میں اُتروں .... (بیل کی طرح ڈکار مار کر) میں وہ شخص ہوں جس کے باپ دادا اُن لوگوں میں سے ہیں جو اس دھرتی کے مالک ہیں۔ اِس کے شوہر ہیں جو ہر وقت اِس سے ہم آغوش رہتے ہیں۔ محبت کے ساتھ، پیار کے ساتھ، جادو منتر کے ساتھ یا حیلے بہانے کے ساتھ۔ مار پیٹ کے ساتھ اِسے مجبور کرتے ہیں کہ اپنے خزانے اُگل کر انسان کے قدموں میں ڈال دے۔ یہی وہ خزانے ہیں جن کی بدولت شاہوں کے تخت و تاج امیروں کے محلات اور اُن کی بیگمات کی آرائش کا سامان، سیٹھوں کی حویلیاں کھڑی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے کارخانے اور لمبی لمبی کاریں، عیاشوں کی عیاشیاں اور اُن کے کلب گھر، ریس کورس اور ریس کورس میں دوڑنے والے گھوڑے حتیٰ کہ افسروں کی شاہانہ تنخواہیں، اُن کے بنگلے اور بنگلوں میں بیگمات، بیگموں کی ساڑھیاں، غرارے، لپ سٹک اور اس قماش کی دوسری چیزیں قائم ہیں۔ او ملعون، او خبیث، او میرے بدقسمت دشمن، تیری موت میرے.......... تو ہنس رہا ہے! حقارت کی ہنسی ہنس رہا ہے۔ تو میرے لوگوں کے پھٹے پُرانے کپڑوں، زرد چہروں، تلخ شکلوں، کراہنے کی آوازوں، اُن کے ننگے سروں اور ننگے پاؤں، اُن کی عورتوں کے خاک آلود چہروں، کھردرے ہاتھوں، بے ڈھب پاؤں، ڈھلکے ہوئے سینوں کا خیال کر کے ہنس رہا ہے۔ حقارت کی ہنسی ہنس رہا ہے۔ تو، لے سُن لے اُن کے چہرے پیلے ہیں تو کیا ہوا؟ اُن کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ یہ سب لال قلعوں میں، تاج محلوں میں، گورنمنٹ ہاؤسوں میں، محلوں، مدرسوں، خانقاہوں کے گارے سیمنٹ میں ملایا گیا ہے۔ تیز رفتار کاروں، ریس کورس کے گھوڑوں میں دوڑ رہا ہے۔ شاہی محل کے کھانوں میں

استعمال ہو رہا ہے۔ ہاتھ خوبصورت ساڑھیاں بُنتے بُنتے بیش بہا زیور گھڑتے گھڑتے، خوش ذائقہ میوا اُگاتے اُگاتے کُھردرے ہو گئے ہیں۔ کپڑے اس لئے پھٹے ہیں کہ جنگی جہازوں توپوں اور گولوں کا بننا ضروری تھا۔ یہ سب چیزیں ہماری ہیں۔ آج دوسروں نے چھین لی ہیں تو کیا ہوا۔ اس وقت تو دوسروں نے ہماری انسانیت بھی چھین لی ہے اور ہم حیوان بنا دیئے گئے ہیں (غور سے دیکھ کر) ابے گدھے، او اُلو، ابے نالائق تو بھی تو اپنی قوم کا کوئی کسان مزدور یا اِس قسم کا کوئی اور حیوان ہے۔ تو کس لئے لڑ رہا ہے۔ اِس لئے کہ وہ محلات قائم رہیں جن میں تجھے داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ کلبیں چلتی رہیں جہاں تیرا داخلہ نہیں۔ اسمبلیاں رہیں جن میں تیرا جانا محال ہے۔ شاہی ضیافتیں ہوں جن میں تو مدعو نہیں ہوتا۔ تیری عورتیں میلی کچیلی رہیں۔ تیرے بچے اَن پڑھ اور کمزور (ہاتھ پھیلاتے ہوئے) آ میرے بھائی مجھے مل۔ میرے ساتھ بغلگیر ہو۔ تا کہ ہم تیرے مُلک اور میرے مُلک کے غاصبوں سے اپنی چھنی ہوئی دولت اپنا کھویا ہوا وقار اپنی اِنسانیت واپس لیں ....''

لیکن جب تاریخ پلٹا کھا چکی ہو اور زمانہ صدیوں کی مسافت طے کر جائے تو پُرانے وقتوں کو ڈھونڈنا بیکار ہے۔ اب اجتماعی تنظیم کا دور ہے۔ انفرادی ترکیبیں دم توڑ رہی ہیں چنانچہ میں بھی کیل کانٹوں کے تولے ماشے میں ایسا محو ہوا کہ رجز خوانی کا خیال ذہن سے یکسر موقوف ہو گیا۔

باب نمبر 5

کایا کلپ

1943ء کے اوائل میں اِس بات کے آثار نظر آنے لگے کہ انڈین فوج کے جرنیلوں کو جاپانی فوج کا مقابلہ کرنے کا گُر مِل گیا ہے۔ اوپر سے جو ہدایتیں آ رہی تھیں اُن میں بہت حد تک اعتماد اور اطمینان آ گیا تھا۔ تجربوں کا زمانہ اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا اور ایک پختہ پالیسی کارفرما ہونے لگی تھی۔ اِس زمانے میں برٹش انڈین آرمی کو ایک طرح کی یکسوئی بھی حاصل ہو گئی تھی۔ اب تک اُس کی نظر ایک طرف جاپانیوں کی طرف تھی جو ہندوستان کی مشرقی سرحد تک پہنچ گئے تھے اور دوسری طرف جرمنوں کی طرف تھی۔ جرمنوں کی یلغار کوہ قاف کے علاقے میں جاری تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے اُن کی متوقع آمد کا مقابلہ کرنے کے لئے خیبر، کُرم، گومل، بولان اور شمال مغربی سرحد کے درّوں میں کروڑوں روپے کے خرچ سے لوہے اور کنکریٹ کے عظیم الشان مورچے تیار کر لئے تھے۔ اپنی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ اِن مورچوں کی آبادی کے لیے اِس سرحد پر جمع کر دیا تھا۔ لیکن دسمبر 1942ء میں ایک بہت بڑے انقلاب کے آثار رونما ہو گئے جس نے جنگ کو ایک نئی شکل دینی شروع کر دی۔ یہ انقلاب تھا سٹالن گراڈ کے محافظین کی بہادری۔ لڑائی میں یہ پہلا موقع تھا کہ جرمنی کی فاتح فوج فتحیاب نہیں ہو رہی تھی اور اُس کا گھمنڈ ٹوٹ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سٹالن گراڈ نے اپنے زخمی لیکن مضبوط پنجے نازی استبداد کے قوی ہیکل دیو کی شاہ رگ میں گاڑ دیئے ہیں۔ انسانیت کے خون پر پلا ہوا یہ درندہ لڑکھڑانے لگا تھا۔ چنانچہ 1943ء کے آغاز میں انگریز شمال مغربی سرحد سے مطمئن ہو کر اپنی فوجیں یہاں سے ہٹا کر ہندوستان کے مشرقی اور وسطی حصے میں لے جانے لگے۔ جنوری 1943ء میں ہم بھی کیمبل پور اور پشاور کے اضلاع کا چکر لگا کر سی پی (صوبہ جات متحدہ) میں چھنڈواڑہ کے مقام پر پہنچ گئے۔

اَب انگریز کی جنگی پالیسی میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ جونہی نئی پلٹنیں کھڑی ہوتی تھیں، ٹریننگ سکولوں اور رجمنٹل سنٹروں سے نو آموز افسر اور سپاہی بن کر نکلتے تھے تو اُن کو ترائی کے جنگلوں خاص کر "بردوان" اور "دہرہ دون" کے علاقے میں جنگل کی ٹریننگ کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ جب کوئی چھ ماہ کے عرصے میں یہ لوگ جنگل کے اسرار و رموز سے آگاہ ہو جاتے تھے تو اُن کو اُن کے بریگیڈوں اور ڈویژنوں میں شامل کر کے سی پی بھیج دیا جاتا تھا تاکہ اعلیٰ پیمانے کی نقل وحمل میں حصہ لے سکیں۔ جب یہ یقین ہو جاتا تھا کہ کسی ایک بٹالین بریگیڈ یا ڈویژن کے افسر اور جوان ایک دوسرے سے واقف ہو گئے ہیں بلکہ دماغی، نفسیاتی اور جسمانی طور پر تومند ہیں تو اُس یونٹ یا فارمیشن کو "رانچی" اور "کھڑگ پور" کے درمیان کے علاقے میں کہیں بھیج دیا جاتا تھا۔ اس علاقے میں جدید ترین ہتھیاروں اور دوسرے سامانِ جنگ کے ذخیرے تھے۔ چنانچہ جب نئی آئی ہوئی یونٹیں اور فارمیشنیں اِن ہتھیاروں اور سامان سے لیس ہو جاتی تھیں تو اِن کو کلکتہ سے مشرق میں "کومیلا" کے مقام پر بھیج دیا جاتا تھا۔ جب وہاں سے یہ لوگ لڑائی کی بو باس سے آگاہ ہو جاتے تھے تو اُن کو بنگال یا آسام کی مشرقی سرحد پر حسب ضرورت بھیج دیا جاتا تھا تاکہ جاپانیوں کی پیش قدمی روکیں۔ انگریزوں نے اُس وقت تک لڑائی سے جو سب سے بڑا سبق سیکھا تھا وہ تھا پرانے خیالات سے چمٹے رہنے (Rigidity) سے پرہیز اور لچک کا استعمال۔ چنانچہ جب ضرورت پڑتی تھی تو قاعدہ کی بجائے بے قاعدگی کا استعمال کر لیتے تھے۔ بہت دفعہ یہ بھی ہوا کہ یونٹیں وسطی سی پی سے سیدھی محاذِ جنگ پر بھیج دی گئیں۔

ہمارے سی پی میں پہنچتے ہی چلا چل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج بارہ میل کا پیدل سفر ہے تو کل پندرہ میل کا۔ اس سے اگلے دن بیس میل کا۔ فوج کی فوج خانہ بدوش تھی۔ ہماری ڈویژن کبھی دوسو میل اِدھر کو نکل جاتی کبھی اُدھر کو۔ جنگی مشقیں ہو رہی تھیں۔ پلٹنوں سے مختلف افسر، سردار، چھوٹے عہدہ دار اور سپاہی مختلف فوجی سکولوں میں جنگ کے جدید ترین طریقے سیکھنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ وہاں سے جب وہ فارغ ہو کر آتے تھے تو اپنے لوگوں میں وہی سبق دہراتے تھے۔ اس طرح اوپر سے نیچے کی طرف اطلاعیں، احکام، ہدائتیں پھیل رہی تھیں۔ ہر سطح پر افسروں اور جوانوں کو حل طلب مسئلے دیئے جاتے تھے جن پر تجربہ کار افسروں کی رہنمائی میں بحثیں ہوتی تھیں۔ متفق علیہ فیصلے اوپر بھیجے جاتے تھے۔ یعنی اگر اوپر سے احکام کی بارش تھی تو نیچے سے اوپر کی طرف بھی عقل اور تجربے کا دریا بہہ رہا تھا۔ اس طرح فوج کا اپنی منزل سے بھٹکنے کا احتمال کم ہو گیا

تھا۔ ہماری ڈویژن جس کا نمبر سات تھا یوں روز بروز رنگ بدل رہی تھی کہ آدمی دنگ رہ جاتا تھا۔ اس کے سولہ ہزار کے لگ بھگ افراد اس یکجہتی کے ساتھ کام کر رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ایک واحد شخص کام کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر ایک آدمی کو کچھ ایسے طریقے سے کام کرنے پر مائل کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنی انفرادی صلاحیتیں کیا دماغی، کیا جسمانی، کیا روحانی استعمال کرنے پر مجبور تھا بلکہ اس کا خواہش مند تھا۔

انگریز اور اس کی فوج کیلئے یہ ایک نئی بات تھی۔ اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ صرف صاحب ہی عقلمند، تجربہ کار، علم وفضل کا مالک اور حاکم ہونے کے قابل تھا۔ اس کا حکم اٹل تھا۔ ماتحتوں کا کام صرف یہ تھا کہ جو حکم ملے اس کو سمجھ کر اُس پر عمل کریں۔ چنانچہ ہندوستانی فوج میں صاحب بہادروں کے "پاگل حکم ناموں" کے بہت سے قصے مشہور تھے۔ بڑے بوڑھے نئے آنے والوں کو یہ قصے سنا سنا کر ایمانِ کامل لانے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ہندوستانی عوام میں 'فوجی' اور 'بیوقوف' کے ہم معنی ہونے کی دوسری وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اب روسی اشتراکی فوج کی کارفرمائی نے یکدم انگریزوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اُنہوں نے اپنی روائیتی فراست سے کام لیتے ہوئے اشتراکی طریق کار کو اپنے حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اشتراکی طریق کار میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عقل اور تجربہ کا بہاؤ صرف اوپر سے نیچے کی طرف نہیں تھا بلکہ اس کے دو دھارے تھے۔ ایک دھارا اوپر سے نیچے آتا تھا اور نیچے آ کر پھیل جاتا تھا۔ اِس میں اِدھر اُدھر سے بہت سے معاون مل جاتے تھے۔ پھر یہ اوپر کی طرف بہنے لگتا تھا۔ اوپر جا کر یہ اور بھی تر و تازہ ہو جاتا تھا اور نیچے کی طرف بہنے لگتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اشتراکی فوج کے افراد میں اگر عہدہ کے لحاظ سے اونچ نیچ تھی تو برابر کے شہری ہونے کی نسبت سے مساوات بھی تھی۔ اگر ایک وقت میں حالات کے تقاضے کی بنا پر جرنیل کا حکم اٹل تھا تو دوسرے موقع پر اس پر لازم تھا کہ اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ سپاہی کی بات سنے۔ اس کے حسن و قبح پر غور کرے۔ فوج کے ہر فرد کو بتایا جاتا تھا کہ کس طرح وہ انسانیت کو فسطائی درندوں سے نجات دلانے کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس کی اپنی فوج کی شکست میں اُس کو، اس کی قوم کو اور انسانیت کو کیا نقصانات پہنچیں گے۔ اس کی اپنی فوج کی فتح میں خود اس کو، اس کی قوم کو اور انسانیت کو کیا انعام مُیسر ہوں گے۔ معمولی سے معمولی سپاہی کو میدانِ جنگ کی حالت، لڑائی کا نقشہ بلکہ ضروری احتیاط کے بعد یہاں تک بتا دیا جاتا تھا کہ آئندہ کیا ارادہ ہے۔ صرف یہی نہیں اس سے کہا جاتا تھا کہ وہ اِن اُمور پر سوچ کر اپنے ساتھیوں کو اپنی عقل وفہم سے مستفید کرے۔ یہی

وجہ تھی کہ جب نازی آندھی کی طرح روس پر چڑھ دوڑے اور آناً فاناً سینکڑوں میل بڑھ گئے تو اشتراکی فوج منتشر ہو گئی۔ لیکن اس میں بھگدڑ نہیں مچی اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اپنی صفیں درست کر لیں۔ اس کے ہر ممبر کو جہاں کہیں بھی تھا یہ پتہ تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کے مقابلے میں کیا بیلجیئم، کیا فرانس، کیا ملایا، کیا برما، جہاں کہیں بھی انگریز فوجیں لڑیں پٹ گئیں۔ جہاں کہیں بھی اُن کے قدم اُکھڑے جمنے نہ پائے۔ جاپانیوں نے تو بالخصوص ہندوستانی انگریزی فوجوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح آگے لگا لیا تھا۔

انگریزوں کے لئے بہت مشکل آ پڑی تھی۔ اگر اشتراکیوں کی طرح انسانی آزادی، مساوات اور مروّت کے گیت گاتے تو ہندوستانی فوجیوں کے دلوں میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ ہم نے کیا قصور کیا ہے جو ہمارے لئے یہ نعمتیں ممنوع ہیں۔ انگریز سمجھتا تھا کہ اس پروپیگنڈے کا خمیازہ فی الفور نہیں تو آئندہ ضرور بھگتنا ہوگا۔ لیکن اگر یہ گیت نہیں گاتے تو فوج کے اندر جوش ولولہ اور یکجہتی نہیں پیدا ہوتی تھی اور دشمن کے مقابلے میں اس کی کارکردگی میں فرق آتا تھا۔ ”سارا دھن جاتا دیکھیو تو آدھا دیو لٹا“ کے مصداق انگریز نے فسطائیوں کے ہاتھوں شکست کھانے کی بجائے ہندوستان کی آزادی کا خطرہ مول لے لینا مناسب خیال کیا۔ یوں فوج میں اشتراکی جمہوریت کے بہت سے پہلو تحلیل شدہ شکل میں رائج کر دیئے۔

تاریخ کا ہمیشہ سے یہ تقاضا رہا ہے کہ انسانی تہذیب کی بلند قدریں پست قدروں کو کھا جاتی ہیں۔ بلاتخصیص اس کے کہ شکست کس کو ہوئی اور فتح کس کو۔ عام حالات میں تو یہی ہوا ہے کہ تہذیب کی بلند قدروں کی قوتوں نے ادنیٰ تہذیب کی قوتوں پر فتح پائی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس حالات بھی رونما ہوئے ہیں۔ مثلاً دراوڑوں پر آریائی قبائیلیوں کی فتح، روم پر قبائیلیوں کا قبضہ، یونان پر روم کا اقتدار، ایران و روم کی شہنشاہتوں پر عرب قبائلیوں کا قبضہ، بغداد کی مغلوں کے ہاتھوں تباہی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میدانِ کارزار میں کسی کی بھی فتح ہو میدانِ معاشرت میں اعلیٰ تہذیب غالب رہی ہے۔ ایران اور روم کی شہنشاہتوں کو درہم برہم کرنے کے بعد عربوں نے کیا کیا؟ انہوں نے بھی بڑی بڑی شہنشاہتیں قائم کر لیں اور وہ بھی چالیس پچاس سال کے اندر اندر۔ کسریٰ کے دربار میں چیتھڑوں میں لپٹا ہوا عرب، ستون کی طرح سیدھا رہا اور پورے اطمینان کے ساتھ چل کر شہنشاہ کے برابر تخت پر بیٹھ گیا۔ لیکن مدائن کے پاس ہی بغداد میں عباسیوں کے دربار میں کسی عرب کو ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مغلوں نے بغداد کو تباہ کر کے کیا کیا؟ خود مسلمان ہو

گئے۔ آریوں نے میدانِ جنگ میں تو دراوڑوں کو شکست دی لیکن ان کی چرواہوں کی تہذیب دراوڑوں کی زرعی تہذیب سے لگا نہ کھا سکی اور بہت جلد دراوڑ دیوتا شیو نے آریائی دیوتا اِندر کو ناکارہ بنا دیا۔ یہی حال سرمایہ داری کی قوتوں کا ہوا کہ جب وہ اشتراکیت کے مقابلے میں یا موافقت میں میدان میں اتریں۔ انسان، انسانی ارتقاء کی نئی صورت ایک قیامت خیز سیلاب ہوتا ہے جو صرف آسمان سے ہی نہیں برستا بلکہ زمین سے بھی مختلف سوتوں کی صورت بہہ نکلتا ہے۔ کہیں کہیں زمین کے ٹکڑے خشک رہ جائیں تو رہ جائیں مگر ہوا ہر جگہ کی مرطوب ہو جاتی ہے۔

نئی صورت نے ہندوستانی فوج کو بھونچکا کر دیا۔ اس کی صدیوں کی روایات، بُرائی بھلائی کے متعلق تصورات، ڈسپلن کے بارے میں اصول اور قواعد سب مٹی میں مل گئے۔ جو زینت کا سامان تھا وہ میل کچیل نظر آنے لگا۔ چند دنوں کے لیے تو اس کے انجر پنجر بالکل ڈھیلے پڑ گئے۔ حکم ہوا کہ مہینے کے مہینے پلٹنوں میں دربار ہوا کرے۔ مہینہ میں کسی ایک مقررہ تاریخ کو ساری بٹالین ایک جگہ جمع ہو جاتی تھی۔ ایک طرف ایک چبوترے پر کرنل صاحب اور ان کے سٹاف افسر، ایجوٹنٹ، کوارٹر ماسٹر، انٹیلی جنس افسر، صوبیدار میجر بیٹھ جاتے تھے۔ مؤخر الذکر کو دربار کے دوران میں بولنے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ کرنل اور سپاہیوں کے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ پہلے کرنل ان سوالوں کا جواب دیتا تھا جو اس تک کمپنی کمانڈروں نے لکھ کر پہنچائے ہوتے تھے۔ اس کے بعد جو کسی کے دل میں آئے پوچھ سکتا تھا۔ صرف ایک شرط تھی کہ سوال معقول ہو۔ کرنل کو سوالوں کا جواب اسی وقت دینا ہوتا تھا یا وعدہ کرنا ہوتا تھا کہ جواب تیار ہونے پر مشتہر کر دیا جائے گا۔ کرنل نے اگر کوئی بات اپنی طرف سے یا افسرانِ اعلیٰ کی طرف سے جوانوں تک پہنچانی ہوتی تھی تو وہ بھی وہیں کہہ دی جاتی تھی۔ جب پہلے دربار کا اعلان ہوا تو افسروں خاص کر سرداروں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے اس کو اپنی صریح بے عزتی سمجھا اور سب سپاہیوں پر واضح کر دیا کہ جو کوئی دربار میں سوال پوچھے گا اس کا حقہ پانی بند۔ چنانچہ پہلے تین درباروں میں سپاہیوں کی طرف سے کوئی سوال نہ ہوا۔ کرنل کو ہر دربار کے بعد سوالوں کی تفصیلات جنرل ہیڈ کوارٹر کو بھیجنی ہوتی تھیں۔

جب تین درباروں کے بارے میں رپورٹ نفی میں ہوئی تو جنرل ہیڈ کوارٹر کی طرف سے کرنل صاحب کو ڈانٹ ملی کہ دنیا میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا انسان ہوگا جسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ ممکن نہیں ہو سکتا تمہاری بٹالین کو ایسی جنت مل گئی ہے جہاں تمہارے آٹھ سو جوانوں کو تین ماہ تک کوئی ایسی تکلیف نہیں پہنچی جس کے متعلق وہ داد فریاد نہ کرنا چاہیں۔ اس معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا

تمہارے لوگوں کو اتحادیوں کی فتح، محاذ جنگ کی خبروں، ہندوستان کی عام سیاسی حالت وغیرہ باتوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کسی نے ان امور کے بارے میں ہی کچھ پوچھا ہوتا۔ رپورٹ کردہ کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر سپاہیوں کو دربار میں سوال کرنے سے باز رکھا گیا۔ چوتھا دربار ہوا تو اتنے سوالات ہوئے کہ کرنل بیچارہ بمشکل دوپہر کے کھانے تک ان سے نپٹ سکا۔ دربار میں جو سوال پوچھے جاتے تھے وہ اتنے اہم نہیں ہوتے تھے بمقابلہ ان سوالات کے جن کے پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ ادنیٰ اعلیٰ ہر افسر کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ سرِ دربار اس کی بے عزتی نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ سپاہیوں کی بات سنتے تھے ان کی جائز شکائتیں دور کرتے تھے اور ان کی بھلائی کی طرف خاص دھیان دینے لگے تھے۔ بٹالین کے تاریک کونے یکا یک اُجاگر ہو گئے۔ خرابیاں کرنے والے عوام کی نظروں کی تاب نہ لا کر صالح بن گئے۔ کمزوروں میں خود اعتمادی اور وقار آ گیا اور طاقتور درندگی چھوڑ کر انسانیت کی طرف رجوع ہو گئے۔ یہ آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کی برکتیں تھیں۔ جن سے ہندوستان کی فوج بھی فیض یاب ہو گئی تھی۔

بٹالین سے صرف دربار کی رپورٹ اوپر نہیں جاتی تھی۔ ہر مہینے کرنل اپنے افسروں کے مشورہ سے ایک اور رپورٹ بھی اوپر بھیجا کرتا تھا۔ اس میں بٹالین کی کارکردگی اس کی صحت، مورال (Morale) ٹریننگ بارے تفصیل سے ذکر ہوتا تھا۔ فوج کے ہر یونٹ سے یہ رپورٹیں جنرل ہیڈ کوارٹر جمع ہوتی تھیں۔ وہاں ان کا خلاصہ تیار کر کے متعلقہ محکموں کو دیا جاتا تھا۔ عام دلچسپی کے معاملات کو ایک خاص سٹاف کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اس سٹاف میں ملک کے چوٹی کے مفکر، عالم، ادیب، مصنف، اخبار نویس جمع کر دیئے گئے تھے۔ یہ لوگ متعلقہ امور پر پمفلٹ اور کتابیں لکھ کر یونٹوں میں تقسیم کرتے تھے اور لیکچروں کا انتظام کرتے تھے۔

یہ ساری باتیں تو اندرونی صفائی کی تھیں اور ان کا مقصد دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے فوج کو مضبوط اور صحتمند بنانا تھا۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے ضروری بات حالات کے مطابق مناسب طریقہ جنگ دریافت کرنا تھا۔ پھر اس کی اتنی مشق کرنی تھی کہ ہر سپاہی اور ہر افسر کی رگوں میں بس کر اس کی جان کا حصہ ہو جائے۔ اس کے لئے دشمن کو جاننا اور پہچاننا بہت ضروری تھا۔ عین اسی طرح جس طرح کوئی شکاری کسی آدم خور شیر کا شکار کرنے جائے تو اس علاقے کے بارے پوچھتا ہے جہاں شیر موجود ہے۔ پھر شیر کی عادات و خصائل اس کی طاقت اور مکاری کے بارے میں پوچھے گا۔ اس کے علاوہ اس کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اب تک اس خاص

شیر کے شکار میں جو کوششیں ہوئیں وہ کیوں ناکام رہی ہیں وغیرہ.......... اس وقت تک جو قصے جاپانیوں کے بارے میں آئے تھے وہ ان کی زبانی تھے جن کو جاپانیوں کے ہاتھوں بے پناہ مار پڑی تھی۔ ملایا اور برما سے جو لوگ بچ کر آئے تھے ان میں سے کم از کم نوے فیصدی نے کسی جاپانی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپانی رات کے وقت حملہ کرتے تھے اور دن کو چھپے رہتے تھے۔ دوسری حقیقت یہ تھی کہ جنگل خود ایک طرح کی رات ہوتا ہے۔ جس پر گولی چل رہی ہو وہ سر اوپر نہیں اٹھاتا اور جو گولی کی مار سے باہر ہو وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ زیادہ تر لوگ وہ تھے جو بھاگتوں کو دیکھ کر ہی بھاگ آئے تھے۔ اس لئے دل میں سخت شرمندہ تھے اور اپنی ندامت پر پردہ ڈالنے کے لئے جاپانیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ تاکہ سننے والے پر یہ واضح ہو کہ اگر وہ وہاں ہوتا تو اس کا نہ بھاگنا بہادری نہیں بیوقوفی ہوتا۔ چنانچہ ان لوگوں کی زبانی جاپانیوں کی جو تصویر بنتی تھی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جاپانی انسان نہیں دیو ہیں۔ ان پر گولی گولے کا اثر نہیں ہوتا۔ ان میں سے ہر ایک طاقت میں رستم اور بہادری میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ دریا ان کے سامنے پایاب ندیاں ہیں۔ پہاڑوں کو وہ پھلانگ کر گزر جاتے ہیں۔ گولی چلانے کی نسبت وہ جوجتسو (Jujitso) کے کرتب دکھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ غرضیکہ جاپانیوں سے لڑنا موت کے منہ میں جانا اور بیوقوفی ہے بلکہ انسانی خون کا ضیاع ہے۔

دو سال کی چھان بین کے بعد اب جا کر جاپانیوں کا صحیح نقشہ قائم کیا گیا اور کتابوں کی شکل میں سب فوجیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ جاپانی واقعی بہادر سپاہی ہیں۔ نہایت اچھی فوجی تربیت پائے ہوئے ہیں۔ جسمانی صعوبتیں حیرت ناک حد تک برداشت کر سکتے ہیں۔ ایک دن میں تیس میل بلکہ اس سے زیادہ چل لیتے ہیں۔ حکم کے نہایت سختی سے پابند ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی بہت سی مثالیں تھیں کہ ایک اکیلا جاپانی کئی کئی دن تک کسی مورچے میں اڑا رہا اور اس کی لاش ہی وہاں سے نکلی۔ جاپانیوں کا سب سے بڑا داؤ دشمن کو دھوکا دینا اور اس کو حیرت [illegible] ڈالنا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے جنگل کو دوست بنا لیا تھا اور جنگلی جانوروں کی طرح اس کی اونچ نیچ سے واقف تھے۔ رات کے وقت حملہ کرتے تھے۔ ایسی سمت سے آتے تھے کہ جدھر سے مدِ مقابل کو ذرا بھی توقع نہ ہو۔ مثلاً کسی دشوار گزار چٹان کے اوپر سے ہو کر، کوئی خطرناک دریا عبور کر کے یا کسی دلدل میں سے ہو کر، جس میں سے ایک عام انسان کا گزر مشکل ہو۔ دشمن پر سیدھا حملہ کرنے کی بجائے کوشش کرتے تھے کہ عقب میں نکل کر سڑک پر مورچہ بنا کر بیٹھ جائیں۔ تاکہ دشمن اپنا راستہ کھولنے

کے لئے اپنے مورچے چھوڑ کر ان کے موچوں پر حملہ کرے اور نقصان اٹھائے۔ جاپانی جانتے تھے کہ جنگل میں گولہ بارود اتنا کارگر نہیں ہوتا جتنا خوف۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھ بہت سے پٹاخے اٹھائے ہوتے تھے جو وزن میں کم ہونے کی وجہ سے گولیوں کی نسبت زیادہ اٹھائے جا سکتے تھے لیکن گولی کی طرح آواز پیدا کرتے تھے۔ وہ رات کے وقت دشمن کی صفوں کے قریب جا کر یہ پٹاخے چھوڑتے رہتے تھے۔ بہت دفعہ ایسا ہوا کہ ہمارے لوگ مقابلے میں اتنا ایمونیشن پھونکتے رہے کہ صبح تک خالی ہاتھ ہو بیٹھے اور یا تو بھاگنا پڑا یا پھر گرفتار ہو گئے۔ گولی نہ ہو تو مشین گن لاٹھی سے بھی بدتر ہوتی ہے۔

جاپانیوں کو سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ وہ ایسے علاقوں میں لڑ رہے تھے جو انگریزوں یا دوسری فرنگی قوموں کے محکوم تھے۔ چنانچہ وہاں کے لوگوں نے انگریزوں سے اپنا بدلہ چکانے کے لئے جاپانیوں کی خوب خوب مدد کی۔ ان کو دشمن کے متعلق اطلاعات بہم پہنچائیں۔ ان کے لئے بار برداری کی اور اپنے ملک کے راستوں پر ان کی راہ نمائی کرتے رہے اور ان کو سامان خورد و نوش بہم پہنچایا۔ جاپانیوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ لکیر کے فقیر تھے اور جب تک جنگ جاری رہی ان کے طریق جنگ میں بالکل تبدیلی نہ آئی۔ دشمن ان کے بھیدی ہو گئے۔ جس طرح ایک استاد شکاری اپنے شکار کا بھیدی ہوتا ہے۔ چنانچہ حالات کے ساتھ نہ بدلنے کا ان کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کا اچھوتا طریق جنگ بہت جلد فرسودہ ہو گیا۔ دورانِ جنگ میں زمانہ بہت لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگتا ہے اور آج کی جدت کل کی دقیانوسیت میں بدل جاتی ہے۔ جاپانی حالات کے ساتھ بدلنے کے کیوں نا اہل ثابت ہوئے میرے خیال میں اس کا سبب فسطائی طریق کار ہے۔ فسطائیوں کا قاعدہ ہے کہ نہ صرف فوج بلکہ پوری قوم میں سوچنے کی قوت کی بیخ کنی کر دیتے ہیں۔ ان کی فلاسفی میں اعتراض کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اوپر سے آئے ہوئے حکموں کی چوں چراں کئے بغیر تعمیل لازمی ہے۔ اس طرح یہ لوگ ساری کی ساری قوم میں اطاعت کا (Conditional Reflex) پیدا کر دیتے ہیں۔ قوم ایک مشین بن جاتی ہے جس میں انسان کل پرزوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جب تک تو مشین میں طاقت کا ذریعہ قائم رہتا ہے اور پرزوں کو تیل ملتا رہتا ہے، مشین کام کرتی رہتی ہے۔ جونہی خرابی آئی مشین بند ہوئی اور کل پرزے بے کار۔ فسطائیوں کیلئے اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ فسطائی طرزِ حکومت میں اقلیت نے اکثریت کا گلا گھونٹ رکھا ہوتا ہے (اشتراکیت میں اس کے برعکس اکثریت نے اقلیت کو قابو کیا ہوتا ہے) اس لئے عوام میں سوچ سمجھ کی ترغیب پیدا کرنا اس

اقلیت کی خودکشی کے مترادف ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک جاپانی سپاہی حکم ملنے پر ایک جگہ بیٹھا بیٹھا جان دے سکتا تھا لیکن یہ کبھی نہیں کرتا تھا کہ حالات کے مطابق حکم میں تبدیلی کر کے ایسی جگہ بیٹھ کر مرے جہاں اس کا مرنا پہلی جگہ کے مرنے کی نسبت قوم کے لئے زیادہ مفید رہے۔ مختصر الفاظ میں جاپانی بہادر انسان نہیں تھے بہادر حیوان تھے۔

اب جاپانیوں کے متعلق معلومات اتنی جلدی جلدی آنا شروع ہو گئی تھیں کہ روز کوئی نہ کوئی نئی بات کوئی نیا واقعہ لکھا ہوا آ جاتا تھا۔ بطور انٹیلی جنس افسر کے میرا کام تھا کہ ان باتوں کو بٹالین افسروں اور جوانوں تک پہنچاؤں۔ دوسرے لوگ کبھی ان باتوں پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ کبھی فضول سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے لیکن میں ان کا خوب مطالعہ کرتا اور اس طرح سے جاپانیوں اور اس کے طریقہ کار کے ساتھ میرا نہایت اچھی طرح غائبانہ تعارف ہو گیا تھا۔ جس کا مجھے میدانِ جنگ میں بطور کمپنی کمانڈر بعد میں بہت فائدہ پہنچا۔ میرا دوسرا کام جس نے مجھے میدانِ جنگ میں بہت فیض پہنچایا میری نقشہ بینی کی ڈیوٹی تھی۔ میرا کام تھا کہ اَن دیکھے علاقوں میں نقشہ دیکھ کر بٹالین کی راہ نمائی کروں۔ تجربہ کے ساتھ مجھے اس کام میں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ جب میں کسی خاص علاقے کے نقشے کا گہری نظر سے مطالعہ کر لیتا تھا اور آنکھیں بند کر کے اس پر غور کرتا تھا تو اس کے راستے، پہاڑ، ندی، نالے سب یوں اُبھر آتے تھے کہ گویا میرے سامنے اصلی حالت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ میں سالہا سال سے وہاں کا باسی ہوں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ہمیں راتوں رات پندرہ بیس میل کا سفر کرنا پڑا۔ میں ایسے سفر پر پلٹن کو یوں لے جاتا تھا گویا اپنے گاؤں کے کسی راستے پر جا رہا ہوں۔ نقشہ بینی میں مہارت نے جنگل کا ہوّا میرے دل سے نکال دیا اور میں کسی زمین کا نقشہ دیکھ کر اس کے جسم پر لپٹے ہوئے درختوں، بیلوں، جھاڑیوں کے لاکھ ستروں کے باوجود اس کے نشیب و فراز بھانپ لیا کرتا تھا۔ لڑائی میں مَیں نے زمین کے نشیب و فراز کی صحیح سمجھ بوجھ اور سلیقہ پا لیا اور اس سے اپنی بقا کا سامان پیدا کر لیا۔

1943ء کے وسط میں حکم آ گیا کہ ہیڈ کوارٹر کمپنی کے "معطیوں" یعنی خاکروبوں، دھوبیوں، ترکھانوں، لوہاروں، ڈرائیوروں، فٹروں، خچر پاتریوں، باورچیوں اور کوارٹر ماسٹر اسٹاف وغیرہ کو ایک علیحدہ کمپنی میں اکٹھا کر دیا جائے۔ جس کا نام ایڈمنسٹریٹو یعنی بندوبستی کمپنی رکھا گیا۔ اس کمپنی کو بروئے کار لانے کی ڈیوٹی میرے سپرد ہوئی۔ اب تک میں نے صرف انٹیلی جنس افسر کے فرائض انجام دیئے تھے۔ یہ میری پہلی کمانڈ تھی۔ میں بہت خوش ہوا اور پورے جوش کے ساتھ اپنے

سپاہیوں کو رابطے میں لانے لگا۔

سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنی کمپنی کے ہر ایک آدمی کے لئے پلٹن کے دوسرے لوگوں کی طرح ہفتہ میں ایک چھٹی لازمی قرار دے دی۔ تا کہ ان کو اپنے جسم اور کپڑوں کی صفائی، دوستوں کے ساتھ گپ شپ، ستانے اور روٹین سے کچھ عرصہ کے لئے نجات کا موقعہ ملے۔ قواعد میں تو ایسا کرنے کو لکھا تھا لیکن اب تک ایسا ہو نہیں رہا تھا۔ جو خاص مشکل پیش آ رہی تھی وہ باورچیوں اور خاکروبوں کے بارے میں تھی۔ کیونکہ ان بے چاروں کو ساتوں کے ساتوں دن کام کرنا پڑتا تھا۔ میں نے ان کے سات حصے کر دیئے اور حکم دے دیا کہ ہفتے میں ایک دن ایک حصہ چھٹی پر رہے گا اور دن بھر کا کام باقی کے چھ حصوں والے سنبھالیں گے یا رائفل کمپنیاں عام سپاہیوں سے ان کی یہ ڈیوٹیاں کروائیں گی۔ رائفل کمپنیوں سے مخالفت کی تو مجھے توقع تھی اور میں اس کے لئے تیار بھی تھا بلکہ کرنل صاحب کو بھی تیار کر رکھا تھا۔ لیکن جب خود میرے اپنے آدمیوں نے جن کا میں اپنے زعم میں بھلا کر رہا تھا اس اقدام کی مخالفت کی تو میں ششدر رہ گیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ ایک ہی ڈگر پر چلنے کے عادی ہو گئے تھے اور ان کے ذہنوں اور جسموں نے اس ڈگر کو زندگی کا ایک حصہ سمجھ لیا تھا۔ اب ایک نئی بات آنے سے ان کو سوچنا پڑ رہا تھا اور اپنی مقررہ چال بدلنی پڑ رہی تھی یا شاید ہفتے میں سات دن کام کرنے کا نشہ سا ہو گیا تھا جو ایک دن چھٹی سے ٹوٹتا تھا۔ کچھ اس قسم کی تکلیف تھی جو ایک سُن ہو چکے عضو میں خون کا دورہ جاری ہونے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ میرے پاس بہت شکوے شکائتیں ہوئیں۔

دوسرا کام جو میں نے کیا وہ اپنی کمپنی میں مساوات اور یکجہتی کا لانا تھا۔ اس کا ایک طریقہ تو ڈرل تھا جو میں نے شروع کروا دی تھی۔ لیکن اس سے مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا۔ ان لوگوں کے لئے ڈرل بھرتی کے وقت سے ہی لازم نہیں تھی اور اب نئے سرے سے سکھانی پڑ رہی تھی جو آسان کام نہیں تھا۔ ڈرل کے علاوہ ہر صبح ساری کمپنی کو ایک کھلے میدان میں لے جا کر دو حصوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ بیچ میں ایک فٹ بال پھینک کر حکم دے دیتا تھا کہ اسے ہاتھوں پیروں سروں سے جیسے بھی ہو مخالف کے علاقے میں سے گزار دو۔ میں خود بھی ایک طرف شامل ہو جاتا تھا۔ آناً فاناً ساری کمپنی گتھم گتھا ہو جاتی تھی اور لوگ جات پات کی سب تمیز بھول جاتے تھے۔ اس ہلڑ بازی میں میری خوب ہی گت بنتی تھی۔ میرے ہاتھ میں فٹ بال آتا تھا تو میں اسے دبا لیتا تھا۔ بس پھر کیا تھا ساری کی ساری شودر قوم مجھ پر ٹوٹ پڑتی تھی۔ یوں منو جی مہاراج کے وقت سے جو جو زیادتیاں

ان پر ہوئی تھیں ان سب کا بدلہ خوانخواہ مجھ سے نکالتے تھے۔

انہیں دنوں میری کمپنی میں ایک چھوٹی سی بغاوت ہو گئی۔ خاکروبوں میں دو پارٹیاں تھیں۔ عیسائی اور غیر عیسائی۔ عیسائیوں کے سردار کیپٹن مارگن جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں تبدیل ہو کر 15 پنجاب کی عیسائی بٹالین میں تشریف لے گئے تھے۔ موصوف وہاں سے اپنے ''ہم گلہ'' خاکروبوں کو خط لکھتے رہتے تھے کہ تم بھی آ جاؤ اور سپاہی بن جاؤ۔ ان لوگوں نے پہلے تو کبھی خیال نہ کیا۔ لیکن جب میں نے مارگنی قاعدے سے پہلا انحراف کرتے ہوئے ایک حقدار لیکن غیر عیسائی خاکروب کو ترقی دے دی تو سب کے سب پیش ہو گئے کہ ''حجور ہماری ارج ہے۔ ہم سپاہی بننا چاہتے ہیں تا کہ سرکار کی خدمت کر سکیں''۔ میں بہت سٹپٹایا کہ ساری شیخی کِرکری ہو رہی ہے۔ بہتیرا سمجھایا کہ بھائیو تم اب بھی سرکار کی خدمت کر رہے ہو۔ لیکن ایک نہ چلی۔ آخر کار مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔ لیکن میں نے ایک شرط لگا دی کہ ان کو رنگروٹی یہیں اپنی پلٹن میں پوری کرنی ہو گی تا کہ پکے سپاہی بن کر جائیں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے دعائیں دیتے چلے گئے۔ دوسرے دن اُن کی رنگروٹی شروع ہوئی۔ دوپہر کے وقت جب باقی دنیا آرام کرتی تو یہ لوگ میدان کے بیچوں بیچ ''فال اِن'' کر لئے جاتے اور بس پھر ڈرل ماسٹر دے اور خاکروب لیں۔ ایک گھنٹے تک ان کا ستیاناس ہو جاتا۔ تیسرے دن میرے پاس آئے کہ صاحب سپاہی گیری بہت ٹیڑھی کھیر ہے ہم ایسی محبت سے باز آئے۔ اب وہ منوا رہے تھے اور میں نہیں مان رہا تھا۔ آخر کار سمجھوتہ ہو گیا کہ بات پہلے جیسے تھی ویسے ہی رہیں گے۔ اس کے بعد اس سمت سے مجھے کبھی تکلیف نہ ہوئی۔

اگست 1943ء بٹالین کے صوبیدار میجر صاحب کو ان کے کسی دشمن نے دستی بم (گرنیڈ) سے مار دیا۔ میں اپنے ایک عزیز ترین دوست سے محروم ہو گیا۔ ہماری پلٹن کا درجہ کاٹ کر اوّل سے دوم کر دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ ہم میدانِ جنگ میں جانے کے قابل نہیں تھے۔ اب ہمارا کام ریلوے لائنوں، بندرگاہوں کی گودیوں، مال گوداموں، ہیڈکوارٹروں پر پہرہ دینا تھا۔ بہت ذِلت ہوئی۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ دو ایک مہینے اِدھر اُدھر کی خاک چھانتے رہے پھر اکتوبر میں چٹاگانگ (مشرقی بنگال) بھیج دیئے گئے۔

باب نمبر 6

جلوسِ عروس

ہمارے ملک میں لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر مہمان سمجھی جاتی ہے۔ جونہی شادی کی عمر کو پہنچتی ہے اور مناسب بَر مِل جاتا ہے تو رخصت ہو جاتی ہے۔ پیدائش کے وقت سے خود لڑکی، اُس کے والدین اور دوسرے عزیزوں، ہمسائیوں، ملنے والوں کا ایک ہی مطمع نظر ہوتا ہے۔ اس کی شادی.........فوج کی نوکری بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہر فوجی، کیا سپاہی، کیا جرنیل، ایک ہی مقصد کے لیے زندہ ہوتا ہے، وہ ہے لڑائی۔ کئی جنگ کے انتظار میں بوڑھے ہو جاتے ہیں اور بانجھ پن میں ہی ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ کئی سالہا سال کی ریاضت کے بعد جنگ کی پہلی گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ یوں بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔ دشمن کے ساتھ پہلی جھڑپ شب عروسی کی طرح بیم و رجا کے اندھیروں اُجالوں سے گھری ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس جھڑپ میں قسمت کی لکیریں کھینچ دی جاتی ہیں۔ ایک فوجی جوان یا ایک افسر یا بٹالین بریگیڈ یا دوسرا فوجی گروپ مستقبل میں کارہائے نمایاں انجام دے گا یا نامرادی کی کالک لئے پھرے گا اس کا فیصلہ بہت دفعہ پہلے ہلّے میں ہو جاتا ہے۔ اس لیے سب متعلقین اس معرکے کے بارے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اگر پہلا فصدِ خون (First Blood Letting) کامیاب رہے تو آئندہ کے لیے بھروسہ قائم ہو جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بھروسہ اور کامیابی ایک دوسرے کے جانشیں ہوتے ہیں۔

ہمارے نئے کرنل کو اُٹھتے بیٹھتے چین نہیں تھا۔ وہ کوئی چھ مہینے سے رات دن ایک کر کے اس فکر میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بٹالین کو میدانِ جنگ میں لڑا دے۔ یہ کچھ یقین نہیں تھا کہ لڑائی سال رہے دو سال رہے یا پھر بالکل ختم ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے پہلے پہلے اپنی قابلیت جتا کر اپنے لئے ترقی کی راہیں کھول لے۔ دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے اس کے پاس نہایت عمدگی سے سدھائے ہوئے آٹھ سو قربانی کے بکرے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی قربانی جلد قبول ہو اور وہ

مرادوں کو پہنچے۔ ایک دستی بم کے پھٹنے اور صوبیدار میجر کی موت نے اس کی سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اب حالت وہی تھی جو قربانی قبول نہ ہونے سے یہودی پیغمبروں کی ہوا کرتی تھی۔ آدمی چلتا پرزہ تھا۔ مل ملا کر اتنا کر لیا تھا کہ بٹالین کو محاذِ جنگ کے عین عقب میں یعنی چٹا گانگ لے آیا تھا۔ ڈیوٹی تو یہاں بھی وہی تھی یعنی رسد کے راستوں کی حفاظت لیکن چٹا گانگ کے رسد کے راستے اُس زمانے کے لاہور کے راستوں سے مختلف تھے۔ یہاں بھی کرنل اپنی بٹالین میدانِ جنگ کی طرف کھسکاتا رہا۔ نومبر 1943ء میں ہم چٹا گانگ کے پہاڑی راستوں (Chittagong Hill Tracts) کے دامن میں پہنچ گئے۔ ان دنوں اسی علاقے میں ایک افریقی ڈویژن اُتری ہوئی تھی جس نے چٹا گانگ ہل ٹریکٹس میں سے گزر کر اراکان کے دریا کلاوان کی وادی میں سے اُتر کر اکیاب (Akyab) کی طرف بڑھنا تھا۔ کرنل نے اپنی پلٹن کو ایک دُم کی طرح اس ڈویژن کے ساتھ چپکا دیا تھا۔ جوں جوں اس ڈویژن کا رسد کا راستہ میدانِ جنگ کی طرف بڑھ رہا تھا ہم بھی آگے کی طرف کھسک رہے تھے۔

کرنل اور میرے تعلقات چچا بھتیجے جیسے تھے۔ وہ اپنے انگریز افسروں تک کے مقابلے میں میری بات مان لیا کرتا تھا۔ میں نے بھی اپنی ڈیوٹی بجالانے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ تاہم کبھی کبھی ہماری جھڑپ ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اس قسم کے انگریزوں میں تھا جنھیں انگریزی زبان میں (Empire Builder) کہا جاتا ہے۔ یعنی انگریزی شہنشاہیت کو پھیلانے والے اور.........

شاہاں در رسمِ شاہی قرابتے ندارند

کے مصداق اس ایک مقصد کے لیے اپنی دوستیاں دشمنیاں سب کچھ "تیاگنے" کو تیار تھا۔ میں نئی پود کا فوجی تھا جس کے دل و جگر میں انگریز کی انڈیا میں موجودگی کانٹے کی طرح چبھتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ہمارے نظریے بھڑ جاتے تھے اور آپس میں بدمزگی پیدا ہو جاتی تھی۔

میری پہلی جھڑپ کرنل کے ساتھ اُس وقت ہوئی تھی جب میں نے انگریزی کھانے سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ جب میں کرنل کے سامنے پیش ہوا تو اُس نے کہا میرے دوست! ہندوستانی فوج میں قاعدہ رہا ہے کہ اُس کے افسر ایک ساتھ مل کر ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے ہیں اور اب تک انگریزی کھانے کا رواج رہا ہے۔ اب تم کو اس پر اعتراض ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جناب عالی بائیس سال سے میں دیسی کھانوں پر پلا ہوں۔ اب ایک دم انگریزی کھانے سے کیسے رغبت پیدا

کر لوں۔ آپ مجبور کریں گے تو کھانا پڑے گا لیکن بھوکا رہوں گا اور اگر اس سے میری کارکردگی میں فرق آیا تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں گا۔ انگریز کو یہ بات پسند آ گئی اور اس نے سب کو دیسی کھانا کھانے کی اجازت دے دی۔ 1943ء میں ہندوستانی فوج کی بہت کم یونٹیں تھیں جہاں ہندوستانی افسروں کو ہندوستانی کھانا ملتا تھا۔ ہم بہت خوش تھے۔ یہ محض ہمارے کرنل کی فہم و فراست کی وجہ سے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ لڑائی کی وجہ سے فوج میں آئے ہیں اور ان کو لڑائی کی وجہ سے فوج میں رکھا گیا ہے۔ ان سے پورا کام لینے کے لیے اگر ان کو ہندوستانی کھانا کھلانا پڑتا ہے تو کبھی جنگ ختم ہو جائے گی تو یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری.........

جوں جوں ہندوستانی افسر تعداد میں بڑھ رہے تھے اور اُن کا فوج کا تجربہ پختہ ہو رہا تھا اُن میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ وہ انگریزوں سے برابر کے سلوک کی توقع رکھنے لگے تھے۔ انگریزوں کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ چنانچہ ہماری اپنی بٹالین میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے علیحدہ علیحدہ گروہ بننے شروع ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی ایسے موقعے پیدا ہو جاتے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی ہمارے ساتھ دوستی لگا لیتا تو اپنے بھائی بندوں میں مطعون ٹھہرتا اور اگر ہم میں سے کوئی اُن کے ساتھ حُسنِ اخلاق سے پیش آتا تھا تو ہم اُسے انگریز کا پٹھو کہہ کر دھتکار دیتے تھے۔ کلکتہ اور چٹا گانگ کے درمیان بحری سفر کے دوران میں ایسے ہی حالات پیدا ہو گئے تھے اور بعد میں بھی یہ مرض بڑھتا ہی گیا۔ "دوہزاری" پہنچے تو کرنل نے ایک دن مجھے علیحدگی میں بُلایا اور اس مسئلہ پر گفتگو شروع کر دی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس میں سراسر قصور سینیئر ہندوستانی افسر کا تھا جو باقی کے ہندوستانی افسروں کو راہِ راست پر چلانے سے قاصر تھا۔ کرنل چاہتا تھا کہ اُس کو پلٹن سے نکال کر مجھے سینئر ہندوستانی افسر بنا دے تا کہ حالات کو مزید بگڑنے سے بچایا جا سکے۔ کرنل نے تو کوئی پندرہ منٹ میں ہندوستانی افسروں کی مذمت پوری کر لی ہو گی مگر مجھے انگریز افسروں کی مذمت کرنے میں پورے پینتالیس منٹ لگے۔ ملاقات کے بعد کرنل کا سرخ چہرہ غصے سے اور بھی سرخ ہو گیا تھا اور میرے چہرے پر سیاہی کی ایک فالتو لہر پھر گئی تھی۔ حالات پہلے سے بھی خراب ہو گئے۔ پندرہ دن تک میں کرنل کے ماتھے نہ لگا اور نہ ہی اُس نے مجھے بُلایا۔ آفیسرز میس میں رات کے کھانے پر ٹکراؤ نا گزیر تھا۔ میں اتنے دن وہاں ہمیشہ کرنل کے آنے سے پیشتر آ جاتا اور اُس کے وہاں سے جانے کے بعد اُٹھتا تا کہ محض کھڑا ہو کے آداب بجالاؤں اور منہ سے اُسے خطاب نہ کرنا

پڑے۔ ان دنوں کام کاج میں میری جانفشانی میں کم از کم سو فیصدی اضافہ ہو گیا تھا۔ آخر کار تنگ آ کر کرنل نے مجھے ''کلاوان'' کی وادی میں بھیج دیا تا کہ بٹالین کے وہاں پہنچنے سے پہلے وہاں کے حالات کا جائزہ لے رکھوں۔

دریائے ''کلاوان'' اکیاب (علاقے کا نام) سے سیدھا شمال کی طرف سے آتا ہے۔ اس کا منبع آسام اور برما کی درمیانی سرحد پر ''لوشائی'' کی پہاڑیوں میں ہے۔ اس کے طاس (پانی) اور دریائے ''کرنافلی'' کے طاس کے درمیان فاصلِ آب برٹش انڈیا اور برما کی درمیانی سرحد ہے۔ اس وقت میرے پاس اس علاقے کا نقشہ نہیں ہے اس لئے مقامات اور فاصلوں کا غلط ملط ہو جانا ناگزیر ہے۔ اس علاقے میں برما اور برٹش انڈیا کے درمیان سوائے سمگلروں کی پگڈنڈیوں کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ عام حالات میں اگر کوئی ''کلاوان'' کی وادی میں جانا چاہتا تھا تو اُسے ''دوہزاری'' سے ''مودک'' کے گاؤں تک کشتی میں کوئی آٹھ دن کا سفر درپیش ہوتا تھا اور اُس کے بعد دو دن کا پیدل سفر۔

افریقیوں نے آتے ہی ''دوہزاری'' کے جنوب سے پہاڑیوں، جنگلوں اور ندی نالوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک جیپ کا راستہ نکالنا شروع کر دیا تھا۔ جن دنوں میں اس علاقہ سے گزرا اس وقت اس کا آدھا حصہ مکمل ہو چکا تھا اور باقی آدھا بھی پورا ہونے ہی والا تھا۔ یہ افریقی بھی عجیب شے تھے۔ سب کے سب کوئی سوا چھ ساڑھے چھ فٹ کے لگ بھگ ہوں گے۔ چھ فٹ سے کم کا تو کوئی آدمی دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ ان کے سڈول جسم، متناسب اعضاء اور آبنوس کی طرح چمکتا ہوا رنگ دیکھنے کی چیز تھے۔ یہ لوگ گولڈ کوسٹ، نائیجیریا، گیمبیا وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پلاٹون کمانڈر اور اُن سے اوپر کے سب افسر انگریز تھے۔ سارجنٹ میجروں اور پلاٹون سارجنٹوں کے ساتھ ساتھ انگریز سارجنٹ میجر اور پلاٹون سارجنٹ بھی تھے۔ حیرانگی کی بات تھی کہ کاروبار اور گفتگو کی زبان انگریزی تھی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ افریقہ کے اس علاقے میں جہاں کے یہ باشندے تھے ذرائع آمدورفت کی کمی کی وجہ سے ایک قبیلہ کی زبان اُس کے ساتھ کے قبیلہ سے مختلف ہو گئی تھی۔ اُردو کی طرح وہاں کوئی ایک زبان ایسی نہ تھی جس کو سب سمجھ سکیں۔ اس لئے کوئی ڈیڑھ سو دیسی زبانوں کو رواج دینے کی بجائے انگریز نے اپنی زبان کو سب کے لیے ضروری قرار دے دیا تھا۔ اَن پڑھ افریقیوں میں جس قسم کی انگریزی رواج پا گئی تھی اس کا سمجھنا کم از کم میرے بس کی تو بات نہیں تھی۔ یہ پڈجن (Pidgin) انگریزی کہلاتی تھی۔

جب میں جیپ میں سوار ہو کر چلا تو ہر طرف افریقی سڑک پر کام کرتے نظر آتے تھے۔ ان کے بیلچے نہایت خوفناک چیزیں تھیں۔ سائز میں ہمارے ہاں کے بیلچوں سے کوئی چار گنا بڑے تھے۔ ایک افریقی جب مٹی کھودتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کوئی جن بھوت کام کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے بوٹوں کو پہننے کی بجائے گلے میں لٹکایا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ بوٹ پہننا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی بہانے ان کو گم کر دیں۔ جب بوٹوں کے گم ہونے کے واقعات حد سے بڑھ گئے تو بوٹوں کا جوڑا کھونے والے کیلئے سخت سزا مقرر کر دی گئی۔ اب یہ لوگ دونوں بوٹوں کے تسمے آپس میں باندھ کر ایک قسم کا ہار بنا کر گلے میں ڈال لیتے تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر وقت ان کو اسی حالت میں لئے پھرتے تھے۔ ان کی ایک چیز جو مجھے پسند آئی وہ اُن کے ''پانگے'' تھے۔ یہ لمبے لمبے سیدھے خنجر سے تھے جس سے یہ لوگ بانس اور دوسری لکڑیاں کاٹتے تھے۔ یہ چیز جنگل میں رہنے والوں کیلئے نہایت ضروری ہے (انہی ''پانگوں'' سے آجکل کینیا میں ''ماؤماؤ'' انگریزوں پر ''ظلم'' کر رہے ہیں) ہمارے پاس بھی انہی ''پانگوں'' کی قسم کی ایک چیز تھی۔ لیکن ہمارے پانگے ان افریقی پانگوں کا بچہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک اور اچنبھے کی بات یہ تھی کہ افریقیوں کے پاس بار برداری کیلئے خچر وغیرہ نہیں تھے۔ ہر بٹالین کے ساتھ اُسکے سامان اُٹھانے والے افریقی تھے۔ یہ لوگ "3.7 دہانے کی پہاڑی توپوں اور اُن کے گولوں سے لے کر راشن کا سب سامان سروں پر اُٹھا لیتے تھے اور فوج کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اپنی حفاظت کے لیے ان سامان برداروں کے پاس سوائے اِن پانگوں کے کچھ نہیں تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا لیکن اندازہ ہے کہ ایک دن کے جیپ کے سفر اور دو دن پیدل چلنے کے بعد میں اور میری پارٹی (ایک جمعدار اور تین سپاہی) دریائے ''کلاوان'' کے کنارے ''ست پانگ'' کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہ گاؤں ''اکیاب'' سے کوئی دو سو میل یا اس سے کچھ زیادہ شمال کو ہو گا۔ یہ جنوری 1944ء کا زمانہ ہے۔ اس وقت دریا میں پانی کم تھا اور جس مقام پر ہم پہنچے تھے وہاں دریا بڑے بڑے گہرے تالابوں پر مشتمل تھا۔ ان تالابوں کی سطحِ آب دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے دو سے لے کر چار فٹ تک کم ہوتی گئی تھی۔ چنانچہ پانی کے دھارے جو ایک تالاب کو دوسرے سے ملاتے تھے کافی تیزی سے بہتے تھے اور پایاب تھے۔ ''اراکان'' کے دریاؤں کی خاصیت ہے کہ یہ بڑی دور تک سطح سمندر کے قریباً قریباً برابر ہی بہتے ہیں۔ چنانچہ سمندر کے مدوجزر کا اثر ''کلاوان'' دریا میں ڈیڑھ سو میل سے زیادہ فاصلے تک ہوتا ہے۔ اس حصے

میں دن کے چوبیس گھنٹے میں دو دفعہ دریا اُلٹا بہنا شروع ہو جاتا ہے یا کم از کم اس کا بہاؤ رکنے سے اس کا پانی اوپر چڑھ آتا ہے۔ دریائے ''کلاوان'' اس علاقے کی شاہراہ ہے۔ امن کے زمانے میں ''اکیاب'' سے کوئی ڈیڑھ سو میل شمال تک اس میں سٹیمر چلتا تھا۔ عام لوگ درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر کے بنائی ہوئی کشتیوں پر سفر کرتے ہیں۔ سامان لیجانے کے لئے بانس کے ''رافٹ'' بنائے جاتے ہیں۔ بہت سے بانس کاٹ لئے جاتے ہیں (دریا کے کنارے ان کے وَل (جتھے) کے وَل لگے ہوتے ہیں) ان کے گٹھے باندھ کر ان گٹھوں کو آپس میں جوڑ لیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک بڑا سا پلیٹ فارم بن جاتا ہے اور حسب ضرورت اس پر سامان لاد دیا جاتا ہے۔ اس کو دھکیلنے کے لیے لمبے لمبے بانس استعمال ہوتے ہیں۔ سائز کے مطابق ان ''رافٹوں'' پر سامان لادا جاتا ہے۔ راستے میں بڑی آبشاریں نہ پڑتی ہوں تو ڈھائی تین ٹن تک سامان لاد لیتے ہیں۔

اس علاقے کے سب پہاڑ شمال سے جنوب کی طرف ہیں۔ دریا اور ندی نالے بھی ایک آدھ موڑ کے علاوہ اسی طور پر بہتے ہیں۔ ''کلاوان'' کے صرف ایک دو معاون ہیں جو ان پہاڑوں کو کاٹتے ہوئے مشرق سے مغرب کو بہہ رہے ہیں۔ پہاڑوں کی بلندی سطح سمندر سے تین ساڑھے تین ہزار فٹ تک ہیں۔ لیکن ''کلاوان'' کی وادی میں عام پہاڑیاں دو سو سے لے کر پانچ سو فٹ تک بلند ہیں۔ چونکہ سطح سمندر اور سطح کلاوان قریباً برابر ہیں اس لئے یہ بلندی خاصی ہے۔ میدان کوئی نہیں ہے۔ پہاڑیاں عین دریا کے کنارے پر آ کر ختم ہوتی ہیں۔ پہاڑیوں کو بانس کے جنگلوں نے چادر کی طرح ڈھانپا ہوا ہے۔ یہ جنگل عام طور پر اتنے گھنے ہیں کہ تیس چالیس گز کے فاصلہ پر چلتا ہوا آدمی مشکل سے نظر آتا ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان وادیوں میں بڑے اونچے اونچے درخت ہیں۔

اس علاقے میں ''کومی'' لوگ آباد ہیں۔ یہ لوگ سکھوں کی طرح بال نہیں کٹواتے لیکن ان کے چہروں پر بال بہت کم اُگتے ہیں۔ مرد سال بھر ایک لنگوٹ میں رہتے ہیں اور عورتیں گز ڈیڑھ گز کے کپڑے کے ٹکڑے کو کولہوں کے گرد لپیٹ لیتی تھیں۔ یہ کپڑے کے ٹکڑے جو گھٹنوں سے اوپر تک رہتے تھے عام طور پر سادے ہوتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی گوٹا کناری کا کام بھی کیا ہوتا تھا۔ مردوں اور عورتوں کے جسموں کے باقی حصے ننگے رہتے تھے۔ ان لوگوں کا رنگ سرخی مائل زرد ہے۔ بہت خوبصورت لوگ ہیں۔ ان کا مذہب جنوں بھوتوں کی پرستش اور پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں اور اطراف پر بانس کاٹ کر ان کو جلا دیتے تھے۔ اس طرح صاف کی ہوئی زمین میں چاول بو دیتے تھے جو برسات کے پانی سے تیار ہو جاتا تھا۔ ان کے مکان بانسوں کے بنے ہوتے

تھے جو عموماً دریا سے ہٹ کر پہاڑ کے پہلو میں بنائے جاتے تھے۔ ''تونبوں'' کو کھوکھلا کر کے گھڑوں کا کام لیا جاتا تھا۔ یہ لوگ سؤر، گائیں (گوشت کے لیے) اور مرغیاں بھی پالتے اور چاول سے بنائی ہوئی شراب پیتے تھے۔ دریا کے کنارے پر تمباکو، تربوز اور سبزیاں اُگائی جاتی تھیں۔ دریا میں مچھلی کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ غرض سوائے نمک اور کپڑے کے یہ لوگ باہر کی دنیا سے بے نیاز تھے۔

میں نے پہنچتے ہی کشتی چلانا سیکھی۔ ان کشتیوں کو چلانے کا ایک اپنا مخصوص ڈھنگ ہے۔ انجان آدمی آگے بڑھنے کی بجائے ایک ہی جگہ اِدھر اُدھر چکر کاٹتا رہتا ہے۔ بہت ہمت کی تو کشتی کو اُلٹ دیا۔ میں چند ہی روز کے بعد کشتی کو سیدھا رکھ لیتا تھا لیکن چپو بہت بھدّے طریقے سے پکڑتا تھا۔ چونکہ آہنگ ردم (Rhythm) کا ابھی تک صحیح اندازہ نہیں ہوا تھا اس لئے جلد تھک جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ مشق سے یہ کمزوریاں دور ہو گئیں۔ جب اتنا ہو گیا تو میں بمعہ اپنے ساتھیوں کے نکل کھڑا ہوا یوں بٹالین کے آنے سے پہلے پہلے سارا علاقہ چھان ڈالا۔

پندرہ جنوری کو ساری افریقی ڈویژن ''کلاوان'' کی وادی میں پہنچ گئی اور انہوں نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ڈویژن کی سپلائی کا بندوبست کچھ اس طرح تھا۔ ڈویژن کی ساری سپلائی ہوائی جہازوں کے ذریعے تھی۔ ہوائی جہاز ضرورت کے مطابق سامان پیراشوٹوں کے ذریعے گرا دیتے تھے۔ جہاں سامان گرتا تھا وہاں سے ڈوج ٹرک اور جیپیں اسے ضرورت کی جگہ پہنچا دیتی تھیں۔ چنانچہ جوں جوں ڈویژن جنوب کی طرف بڑھ رہی تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ Dropping Zone (وہ مقامات جہاں جہازوں سے سامان پھینکنا ہوتا تھا) بنا دیئے جاتے تھے۔ یہ ایسی جگہ ہوتی ہے جو نہ صرف ہموار ہو بلکہ درختوں سے صاف اور پہاڑیوں سے ہٹ کر ہو۔ تاکہ سپلائی کرنے والے ہوائی جہاز نیچے تک پرواز کرتے ہوئے سامان آسانی سے پھینک سکیں اور پھینکا ہوا سامان آسانی سے اکٹھا ہو سکے۔ ایک ڈراپنگ زون سے دوسرے تک چونکہ گاڑیاں لے جانی ہوتی تھیں اس لئے ساتھ ساتھ ایک کچی سڑک بھی بنائی جا رہی تھی۔

افریقی بہت اُمیدوں کے ساتھ انڈیا آئے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے سال بھر مغربی افریقہ کے ایک علاقے میں جنگل کی لڑائی کی مشق کرتے رہے تھے۔ اس مشق سے اتنے خوش تھے کہ اب اپنے آپ کو استاذ الاساتذہ سمجھنے لگے تھے۔ ہندوستانی فوج کو چونکہ اس وقت تک جاپانیوں کے ہاتھوں مار پڑ رہی تھی اس لئے ہمیں کافی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جنگ کے بارے میں ہماری بات

سُننے کو ہتک خیال کرتے تھے۔ جب ہم ان کے افسروں کو لاف زنی کرتے سُنتے اور وہ دورانِ گفتگو اچٹتی سی حقارت کی نظر ہماری طرف پھینکتے دیکھتے تو ہم شرم سے زمین میں گڑ جاتے۔ مقام ہی ایسا تھا۔ ہم پٹے ہوؤں میں سے تھے اس لئے ہمارا سچ بھی جھوٹ تھا۔ یہ لوگ تازہ دم تھے۔ ان کا امتحان ابھی باقی تھا ہو سکتا تھا کہ مسئلہ کا جو حل یہ لوگ ڈھونڈ کر لائے تھے وہی صحیح ہو۔ بہر حال اُن کے تیور ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ ہم میں سے کئی لوگ دعائیں کرتے رہتے تھے کہ ان کو خوب ہی مار پڑے۔

افریقیوں نے نئی بات کون سی پیدا کی تھی؟ جس علاقے میں انہوں نے ٹریننگ کی تھی وہاں کوئی جگہ بھی سطح سمندر سے پچاس فٹ سے زیادہ بلند نہ تھی۔ اس لئے کسی ایک جگہ کو کسی دوسری جگہ پر اہمیت دینا بے معنی تھا۔ لہٰذا ان کا لڑائی کا پہلا اصول یہ تھا کہ کسی جگہ کو مضبوطی سے نہ پکڑو بلکہ گھومتے پھرتے رہو اور اس طرح دشمن کو پریشان کر کے مارو۔ ان کے ٹریننگ کے علاقے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اُگی ہوئی جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ لیٹا ہوا آدمی بندوق چلاتا تو ایک طرف دو قدم آگے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس سے اور پہاڑیوں کے نہ ہونے سے انہوں نے دوسرا اُصول گھڑ لیا تھا کہ مورچہ مت کھودو۔ اس سے آدمی ایک جگہ کا ہو رہتا ہے اور پہلے اُصول میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اب جس علاقے میں ان کو لڑنا پڑ رہا تھا وہاں جنگل تو بہت گھنا تھا لیکن پہاڑیوں پر تھا۔ جہاں پہاڑیاں ہوں گی وہاں جنگی نقطہ نظر سے سب جگہیں برابر نہیں ہو سکتیں۔ بہت سی پہاڑیاں کمانڈنگ پوزیشن میں ہوں گی۔ بہت سی راستے میں ہوں گی۔ بہت سی پر قبضہ محض اس لئے ضروری ہوگا کہ وہاں دشمن پر نظر رکھنے کے لیے چوکی (Observation Post) بنا کر بوقتِ ضرورت توپ خانہ سے بھی فائر کرائے جا سکیں۔ بعض پر قبضہ اسلئے ضروری ہوگا کہ دشمن ان پر چڑھ کر اپنے توپ خانے کی جگہ نہ بنا ڈالے۔ بعض پہاڑیوں پر قبضہ اسلئے ضروری ہوگا کہ اگر دشمن کا زور بڑھ جائے تو وہاں جم کر اس کا مقابلہ کیا جا سکے اور جہاں اپنے اِدھر اُدھر سے بھاگے ہوئے لوگ اکٹھے ہو سکیں۔ اب اگر افریقی ڈویژن والے پہاڑیوں کے وجود کو مانتے تھے تو اُن کے دونوں پہلے اُصول کٹ جاتے تھے۔ اُن کے پاس ہندوستانی فوج سے ممیز ہونے کیلئے سوائے رنگ اور قد کے کچھ نہیں بچتا تھا۔ لہٰذا فیصلہ کر دیا گیا کہ جہاں تک میدانِ جنگ کا تعلق ہے پہاڑیوں پر تھوکو تک نہیں، بس سمجھ لو کہ برما میں نہیں مغربی افریقہ میں لڑ رہے ہیں۔ آخر میں افریقی ڈویژن کی حالت کچھ وہی ہوئی جو فن لینڈ کے اِن مولانا صاحب کی ہوئی تھی جو روزے کی

افطاری کے انتظار میں دوپہر سے پہلے ہی جنت کو سدھارے تھے (وہاں گرمی کے موسم میں سورج تین ماہ تک لگاتار نظر آتا رہتا ہے)

پہلے تیس میل کے ایڈوانس میں کوئی جاپانی نظر نہ آیا۔ اس کے بعد دو تین جاپانی نظر پڑے جو افریقیوں کو دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سکاؤٹ تھے۔ لیکن اس وقت افریقیوں میں مشہور ہو گیا کہ جاپانی دراصل اُن کے ڈر سے بھاگے ہیں۔ اگلے ساٹھ ستر میل ڈویژن نے کوئی ایک مہینہ میں طے کئے۔ حالانکہ اُن کے مقابلے میں محض مٹھی بھر جاپانی تھے۔ افریقی لافیں مارا کرتے تھے کہ وہ چند ایک جاپانیوں کو زندہ پکڑ کر ایک دو کو بھون کر کھا لیں گے۔ باقیوں کو چھوڑ دیں گے تا کہ وہ واپس جا کر اپنے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلائیں۔ یہاں حالت یہ تھی کہ ڈویژن سو میل بڑھ گئی تھی۔ ایک مردہ جاپانی بھی ہاتھ نہیں لگا تھا۔ جاپانی اُن کو یوں تنگ کر رہے تھے جیسے کُتے بھیڑوں کے گلے کو دق کر دیتے ہیں۔ وہ کسی ایسی پہاڑی پر جو افریقیوں کے راستے میں پڑتی تھی گہرے مورچے کھود کر بیٹھ جاتے تھے اور وہاں سے گزرتے ہوئے افریقیوں پر فائر کرتے رہتے تھے۔ اب ایک آدمی پہاڑی کو ذہن سے شاید نکال بھی لے لیکن بندوق کی گولی سے کیسے پیچھا چھڑائے۔ چنانچہ افریقیوں کو اِن پہاڑیوں پر حملہ کرنا پڑتا تھا۔ پہاڑی پر حملہ کرنے کی ٹریننگ نہ ہو تو یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ افریقیوں نے ایسی ٹریننگ ضروری نہیں سمجھی تھی۔ چنانچہ جب تک بعد از خرابی بسیار یہ لوگ پہاڑی پر چڑھتے تھے جاپانی جا چکے ہوتے تھے۔ مصیبت یہ بھی تھی کہ افریقیوں کے اُصول میں کسی جگہ مورچہ کھودنا اور کسی ایک جگہ پر قبضہ کرنا ناجائز تھا۔ جاپانی موقعہ پا کر واپس آ جاتے تھے اور وہی کام شروع ہو جاتا تھا۔ یہ افریقیوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس علاقے میں بہت کم جاپانی اُن کے مقابلے میں موجود تھے۔ سو میل کے بعد ''اراکان'' کا میدان شروع ہو گیا۔

یہاں جنگل کی بجائے چاول کے کھیت تھے اور یہاں افریقیوں کے اُصول میں سے ایک بھی لاگو نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے ڈویژن کا ایڈوانس رُک گیا اور ڈویژن نے ایک مناسب میدان ڈھونڈ کر ڈیرے ڈال دیئے۔ اس میدان کے بیچوں بیچ ایک پہاڑی تھی جسے ''پگوڈا پہاڑی'' (Pagoda Hill) کہتے تھے کیونکہ اس پر بدھوں کا ایک مندر یعنی ''پگوڈا'' بنا ہوا تھا۔ افریقیوں نے حسبِ معمول اِسے 'میدان' سمجھا ہوا تھا۔ چار مارچ 1944ء کی رات کو جاپانیوں نے اس پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ میدان میں پڑے ہوئے ایک ایک افریقی کو گن سکتے تھے۔

چنانچہ اُن کے توپ خانے نے بہت مہارت کے ساتھ گولہ باری شروع کر دی۔ افریقی کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ جاپانیوں کو پہاڑی سے ہٹانے کے لیے پے در پے حملے شروع کر دیئے گئے۔ لیکن چونکہ وہ افریقی اُصولوں پر کاربند نہیں تھے اس لیے انہوں نے خوب گہرے مورچے کھودے ہوئے تھے اور افریقیوں کی ایک نہ چلی۔ آخر کار پوری کی پوری افریقی ڈویژن دریا کو عبور کر کے اس کے بائیں یعنی مشرقی کنارے سے مغربی کنارے پر آ گئی۔ اس سے مجھے جو تکلیف پہنچی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس افریقی ڈویژن نے دوسرے سال ایک نئے ڈویژن کمانڈر کی سرداری میں جنگ کے نظریہ میں ردوبدل اور مناسب تربیت کے بعد نہایت اچھا کام کیا۔ یہ بھی واضح ہو کہ افریقیوں میں تمام افسر انگریز تھے۔ نیچے کے عہدیدار دوہرے یعنی ایک افریقی اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ ایک انگریز تھا۔ اقتدار انگریز سارجنٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے جو اوپر لکھا ہے کہ افریقی یہ کہتے تھے اور یوں لاف زنی کرتے تھے یہ اُن انگریزوں کی نسبت ہے۔ خود افریقی تو بیچارے بے زبان تھے۔ وہ ہم سے کہیں زیادہ انگریزوں کے رحم و کرم کے محتاج تھے۔ ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ افریقی ڈویژن کے انگریز افسر ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ افریقیوں اور ہندوستانیوں میں میل جول نہ ہو۔ لیکن لڑائی میں ایسے بندھن ممکن نہیں ہوتے۔ چنانچہ ایک زمانے میں ہمارے کوارٹر ماسٹر کیپٹن رفیق نے جو تربیت یافتہ وٹرنری ڈاکٹر تھے جب دیکھا کہ افریقیوں کے علاج کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے تو اُن کے لئے ایک ڈسپنسری کھول دی۔ چنانچہ روزانہ بیسیوں افریقی اُن کے پاس علاج معالجہ کے لئے آنے لگے۔ وہ کھلے بندوں کہتے تھے ''برٹش نو گڈ۔ انڈین کوارٹر ماسٹر گڈ''۔ میرے اردلی خدا بخش نے کئی افریقی دوست بنا لئے تھے۔ یہ سوائے السلام علیکم کے ایک دوسرے کی زبان بالکل نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن پھر بھی گھنٹوں بیٹھے گفتگو چلاتے تھے اور ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد انگریز شکایت کرنے لگے تھے کہ ہندوستانیوں کا افریقیوں پر بُرا اثر پڑ رہا ہے اور وہ کہنے لگے ہیں کہ انڈین کی طرح اُن کو بھی افسری عہدے ملنے چاہئیں۔ اس وقت افریقہ کی جنگِ آزادی میں کئی سابقہ سارجنٹ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

جنوری کی آخیر تک ہماری بٹالین بھی دریائے ''کلاوان'' کی وادی میں پہنچ گئی۔ کرنل صاحب نہایت تندی سے کام لیتے ہوئی بٹالین کو میدانِ جنگ کی طرف دھکیل رہے تھے۔ میں نے سب

کا استقبال کیا اور علاقے کے حالات سے آگاہ کیا۔ بٹالین کی بحیثیت مجموعی وہی حالت تھی جو ایک گھوڑے کی ریس سے پہلے ہوتی ہے۔ اس کے جسم کے ایک ایک انگ سے سالہا سال کی تیاری نہایت بیقراری سے نمودار ہو رہی تھی۔ وہ جوش سے سر سے پاؤں تک کانپتا ہے۔ ہم میں سے کئی کو بیس بیس سال سے اس لمحے کیلئے تیار کیا جا رہا تھا اور کئی کو دو سال سے۔ برسوں لوگوں نے مصنوعی مشقوں میں حصہ لیا تھا، کورس کئے تھے۔ ترقی کے امتحان پاس کئے تھے، انسٹرکٹروں کی جھڑکیاں سہی تھیں اور گھر بار کو چھوڑا تھا۔ سرکار کے خزانے پر بوجھ ڈالا تھا۔ محض اس لئے کہ لڑائی لڑ سکیں۔ بیسیوں سورما مائی ماؤں کے لال پہلی ہی جھڑپ میں گولیوں کی پہلی بوچھاڑ کی نذر ہو جائیں گے اور سالہا سال کی پرورش، تعلیم اور تربیت آنکھ جھپکنے میں مٹی میں مل جائے گی۔ کئی دوسرے عمر بھر کے لئے اپاہج ہو جائیں گے۔ کئی ایک اس طوفانِ بلا میں صاف بچ جائیں گے۔ بعض سُرخرو ہو کر نکلیں گے۔ میں جس کسی کو بھی دیکھتا تھا اس کے چہرے پر یہی لکھا تھا ''اب کیا ہوگا''۔ دوست دوستوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ معلوم نہیں کب موت اِن دوستیوں کا شیرازہ بکھیر دے۔ آرزو اور خوف کے ملے جُلے جذبے بھی تھے کہ اس نفسا نفسی میں دوستی کی لاج رہ جائے۔ لوگوں کی ذاتی دشمنیاں تک آنے والے سانحہ کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئی تھیں۔

باب نمبر 7

جنگ

"میرا خیال ہے تم "سی" کمپنی سنبھال لو"

"میں؟"

"اور کیا"

"لیکن.........."

"لیکن؟"

"مجھے رائفل کمپنی کا تجربہ نہیں ہے"

"بکواس بند کرو اور صبح سے کام شروع کر دو"

یہ کہہ کر کرنل چھری کانٹا سنبھال کر کھانے میں لگ گیا اور میں بدستور کانٹے کے ساتھ کھیلتا رہا۔

کئی دنوں سے یہ بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ کئی دفعہ میں نے کان کے پیچھے سے دیکھا تھا کہ کرنل مجھے گھور رہا ہے۔ کئی دفعہ میں نے اسے دوسرے انگریز افسروں کے ساتھ کانا پھوسی کرتے دیکھا تھا۔ اگرچہ ان کا ایک لفظ بھی میرے پلّے نہیں پڑا تھا لیکن دل کا اندازہ تھا کہ گفتگو اپنے ہی بارے ہے۔ سو آج راز کھل گیا تھا۔ ڈیڑھ سال کی نوکری کے بعد میدانِ جنگ میں ایک رائفل کمپنی کی کمان فوج کے دستور کے مطابق بہت بڑی عزت تھی۔ کوئی فوجی آدمی بھی پھولا نہ سماتا لیکن مجھ پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ باوجود کوشش کے میں اپنے آپ کو فوجی تصور کرنے سے معذور رہا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میرا مستقبل برٹش انڈین فوج کے ساتھ ہمیشہ وابستہ ہے۔ میں ہمیشہ ایک اجنبی سا بنا رہا ہوں۔ اس لئے فوج کی خوشیوں غمیوں سے کچھ بہت متاثر نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت میرے خیالات اپنی عزت افزائی کی طرف نہیں بلکہ کام کی نوعیت کے بارے میں تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کرنل نے رائفل کمپنی کا کمانڈر مقرر کر کے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مجھے ڈرل اور دوسرے فوجی دھوم دھڑکے سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ رائفل کے ساتھ اس وقت تک میں نے صرف پندرہ عدد گولیاں چلائی تھیں۔ دس بنگلور میں اور پانچ پلٹن میں پہنچ کر۔ برین گن کے ساتھ بنگلور کے تعارف کے بعد واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہی حال دوسرے ہتھیاروں کا تھا۔ میں نے کوئی فوجی ٹریننگ کورس نہیں کیا تھا۔ جب بھی میں نے اصرار کیا تو کرنل نے یہی جواب دیا تھا کہ تمہیں کورس کی ضرورت نہیں ہے اور اس موضوع پر مزید گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ برما آنے سے پہلے رانچی کے مقام پر صرف پندرہ دن کا ایک کمپنی کمانڈروں کا مقامی کورس کیا تھا۔ سکول کے افسر جاپانیوں کے متعلق میری معلومات پر بہت خوش ہوئے تھے۔ میرے کانوں میں بھنک سی پڑی تھی کہ اُنہوں نے کرنل کے پاس مجھے رائفل کمپنی کی کمانڈ دینے کی پُرزور سفارش کی تھی۔ یہ کوئی چھ مہینے پہلے کی بات تھی۔ اُس وقت اگر مجھے کمپنی مل جاتی تو مجھے کوئی تردّد نہ ہوتا لیکن اب جبکہ لڑائی کی تپش محسوس ہونے لگی تھی دفعتہً رائفل کمپنی کی کمانڈ دے دینا سراسر زیادتی تھی اور کمپنی بھی ڈوگروں کی! اِن میں سے کئی کی شکلیں میرے گاؤں کے بنیوں سے ملتی تھیں۔ اس لئے جو نفرت مجھے ایک بنئے سے ہو سکتی ہے وہ ان کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر جنیئو نے پوری کر دی تھی جو تقریباً سبھی نے پہن رکھا تھا۔ مجھے ایک اور تشویش بھی تھی۔ ان دنوں اس کمپنی کا ستارہ گردش میں تھا۔ اس کا سینئر اُستاد اور چند ایک دوسرے عہدیدار صوبیدار میجر کے قتل کی تفتیش میں آ کر فوج سے نکالے جا چکے تھے۔

چٹا گانگ میں قیام کے دوران اس کے آٹھ دس آدمی سوزاک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ کمپنی بہت بددل ہو چکی تھی اور کمپنی کمانڈر کی نرم دلی کی وجہ سے روز بروز اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے رہے سہے ولولے کو جس شئے نے ٹھنڈا کر دیا تھا وہ تھی مردم کشی سے میری نفرت۔ تاریخ میں جتنے خونخوار لوگوں کا میں نے ذکر پڑھا تھا ان سب سے مجھے نفرت تھی۔ پھر آدمی خون بہائے بھی تو کس کی خاطر؟! اگرچہ اس وقت تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت فسطائی وحشیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانا تھا۔ لیکن جب میں انگریز کی شکل دیکھتا تھا تو یہ احساس تے ہو کر ذہن سے نکل جاتا تھا اور میں بالکل خالم خالی رہ جاتا تھا۔ لیکن کر بھی کیا سکتا تھا کافی دلگیری کی ساتھ اپنا کام سنبھال لیا۔

پہلے ایک دو دن یونہی کمپنی میں گھومتا رہا۔ دن کے مختلف وقتوں میں کمپنی کے ایریا میں جاتا۔ سرداروں اور دوسرے عہدہ داروں سے بات کرتا۔ کسی سپاہی کو بھی ایک دو لفظ کہہ دیتا اور ایک آدھ گھنٹے کے بعد اپنی جگہ واپس آ کر دو تین گھنٹے سوچنے میں گزار دیتا۔ کوئی اُلجھن پیدا ہوتی تو واپس کمپنی ایریا میں چلا جاتا۔ کبھی کبھی ایک طرف کسی گرے ہوئے درخت کے تنے پر اپنے لوگوں سے پیٹھ پھیر کر بیٹھ جاتا۔ تاکہ سپاہی میری موجودگی کو اپنے کاروبار میں خلل خیال نہ کریں۔ اس طرح بیٹھ کر میں کوشش کرتا تھا کہ کمپنی کی رہت سہت، لوگوں کے آپس کے تعلقات، دوستی اور پیار بغض و عناد، لنگر میں برتنوں کی جھنکار، اسلحہ خانے میں ہتھیاروں کے اُٹھانے اور رکھنے کی آوازیں، سرداروں کی گالیاں، سپاہیوں کی گستاخیاں، جھگڑے اور قہقہے، ان سب کو ملانے سے جو قوام تیار ہوتا تھا کانوں کے ذریعے اس کا اندازہ لگا سکوں۔ دلوں کے دروازے ابھی تک مجھ پر بند تھے۔ اس لئے تانک جھانک سے اپنا مطلب پورا کر رہا تھا۔

حالات ہمت افزا نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمپنی کا گودا کسی نے نکال لیا تھا اور محض خول باقی تھا۔ سینئر سردار اور دوسرے کئی عہدہ داروں کے مسلمان صوبیدار میجر کے قتل میں ماخوذ ہونے سے کمپنی کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں اگر جرم ثابت ہو جاتا تو بہتر تھا۔ قاتل اپنے کئے کی سزا بھگتتا۔ لیکن معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ شک کی بنا پر کمپنی کے لوگ فوج سے نکال دیئے گئے تھے۔ اس لئے ساری کی ساری ڈوگرہ قوم اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہی تھی۔

میری صوبیدار میجر مرحوم کے ساتھ دوستی کی چونکہ سب کو اطلاع تھی اس لئے میرا کمپنی کی کمانڈ سنبھالنا ڈوگروں کے لئے بارگراں ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ میری اور کمپنی کی پہلی ملاقات میں دوستی نہیں بلکہ خصومت نمایاں تھی۔ یہ خصومت کم ہوتے ہوتے کئی مہینوں میں جا کر ختم ہوئی۔ اس دوران میں محبت کا ننھا سا پودا جو اس مرتی ہوئی خصومت کی جڑوں میں پروان چڑھ رہا تھا جوان ہو گیا اور ہمارے تعلقات میں خلاء پیدا نہ ہوا۔ قتل کی تفتیش کے دوران میں کمپنی کو بُری طرح لتاڑا گیا تھا۔ چنانچہ سب ڈوگروں کے دلوں میں عجیب طرح کی بے بسی، خوف اور ندامت گھر کر گئے تھے۔ اس حادثے کے بعد پے در پے ایک دو اور حادثے بھی گزر گئے۔ چنانچہ میں نے جس وقت کمپنی کی باگ ڈور سنبھالی اس کی بے دلی حد کو پہنچی ہوئی تھی۔ آثار کچھ اس قسم کے تھے جو قوموں کے دورِ انحطاط میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ تنگ نظری کوتہ اندیشی، خانگی جھگڑے، کم ہمتی اور قنوطیت کے ساتھ ساتھ کانگڑہ، جموں اور ہوشیار پور کے لوگوں کی آپس میں ہُوتم بیزار ہو رہی تھی۔ سپاہیوں کی

وردیاں میلی تھیں اور ان کا چلنا پھرنا یوں تھا کہ جیسے زندگی سے بیزار ہوں۔ عہدے کا رکھ رکھاؤ بہت کم تھا۔ سپاہی کھلے بندوں اپنے افسروں کو گالیاں دیتے تھے۔

پہلے دو دن میں نے بہت تردّد میں گزارے۔ لڑائی سر پر کھڑی تھی۔ افریقیوں کی جاپانیوں کے ساتھ جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ میں خود تو ناتجربہ کار تھا ہی۔ اس پر کمپنی ایسی ملی تھی جس کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ چنانچہ بے حد ذہنی کوفت میں مبتلا ہو گیا۔ تیسرے دن صبح سویرے ہی کمپنی پر ٹوٹ پڑا اور سب طرف افراتفری پھیلا دی۔ کوئی آدھ گھنٹہ میں حالت ایسی تھی کہ آدھے آدمی میرے حکموں کی تعمیل میں بھاگے پھر رہے تھے۔ میں نے پہلا حکم یہ دیا تھا کہ سب کام ڈبل مارچ سے ہو گا۔ سرداروں نے کچھ ناک بھوں چڑھائی تھی لیکن میرے تیور دیکھ کر چپ ہو رہے اور باقیوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

کمپنی نے دریا کے کنارے یوں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے کہ گویا پکنک ہو رہی ہے۔ کوئی بیس قدم کے فاصلے پر ایک پہاڑی سر پر کھڑی تھی۔ لیکن سوائے ایندھن اکٹھا کرنے کے کسی نے اس پر چڑھ کر نہ دیکھا تھا۔ میں نے سرداروں کو بُلایا اور پوچھا۔ ''آپ نے اس پہاڑی کی چوٹی کی بجائے اس کے قدموں میں کمپنی کو کیوں بٹھائے رکھا ہے''۔

''صاحب باقی کمپنیوں نے بھی ایسا ہی کر رکھا ہے''۔

''میں اپنی کمپنی کی بات کر رہا ہوں''۔

''افریقی ڈویژن کا یہی حکم ہے''۔

افریقی ڈویژن سے آپ کا کیا واسطہ ہے''۔

''ہم ان کے ماتحت ہیں''۔

''آپ کی کمپنی بلاواسطہ ان کے ماتحت ہے یا بٹالین ہیڈ کوارٹر کے ذریعے آپ تک احکام پہنچتے ہیں''۔

''ہاں جناب ہم تو بٹالین ہیڈ کوارٹر سے ہی اپنے حکم حاصل کرتے ہیں''۔

''اگر دشمن کی ایک حقیری ٹولی بھی اس پہاڑی پر آ بیٹھے تو آپ کا کیا حشر ہو گا''۔

''(سوچ کر) حشر تو بہت بُرا ہو گا۔ لیکن کہاں ہے دشمن؟''

''اس کی تو مجھے اطلاع نہیں شاید یہیں کہیں ہو۔ میرے ساتھ اس پہاڑی پر آیئے۔ مَیں آپ کی پلاٹونوں کے لئے جگہ مقرر کر دیتا ہوں۔ آج شام تک مورچے تیار ہو جائیں''۔

''بہتر جناب لیکن لنگر یہیں رہنے دیجیے پانی ڈھونڈنے میں بہت تکلیف ہو گی''۔

''یہاں لنگر کی کون حفاظت کرے گا کمپنی کو یکجا ہونا چاہیے''۔

چنانچہ ہم پہاڑی پر چڑھ گئے۔ مندرجہ بالا گفتگو کی طرح مزید گفتگو ہوئی اور شام تک لوگوں نے پہاڑی پر اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ میں بحث سے بالکل نہیں گھبراتا تھا بلکہ کئی دفعہ جب دیکھتا تھا کہ معاملہ صاف ہوئے بغیر ہی بحث ختم ہو گئی ہے تو بحث کو جان بوجھ کر طول دے دیا کرتا تھا۔ اتنا خیال رکھتا تھا کہ بحث برائے بحث ہو کر نہ رہ جائے۔ اس سے مجھے دو فائدوں کی توقع تھی۔ ایک تو کمپنی کے کام بارے اپنی معلومات میں اضافہ اور دوسرے عہدہ داروں کی اہلیت کا صحیح اندازہ۔ علاوہ ازیں ایسی مجلسوں سے اپنے لوگوں کے ساتھ رابطہ بھی بڑھتا تھا۔ لیکن ایک دفعہ فیصلہ ہو جانے کے بعد کسی کو مزید بحث کی اجازت نہ تھی اور بہت کڑی پابندیوں کے ساتھ فیصلے پر عمل ہوتا تھا۔ کوئی چار دن کے بعد میں نے ساری کمپنی کا اجلاس بلایا۔ سب سے پہلے کمپنی میں جو خرابیاں آ گئیں تھیں ان سب کو ایک ایک کر کے بیان کیا۔ پھر کمپنی کی اس وقت کی حالت کا ذکر کیا اور آخر میں اِن کو اِن کی راجپوتی روایات کے نام سے اُبھارا اور اصرار کیا کہ اِن کو کمپنی کے ماتھے پر سے بدنامی کا ٹیکہ دھونا ہو گا۔ جس کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا کام (مجھے ڈوگروں کی تاریخ کے بارے میں بہت کم واقفیت تھی بس اتنا پتہ تھا کہ ہر قوم کو اپنی سابقہ روایات پر فخر ہوتا ہے) میں نے یہ بھی کہا کہ میں ان کے ساتھ ہوں۔ ان کی عزت ذلّت کا ساتھی۔ اس تقریر کا کافی اچھا اثر ہوا۔ پورا ایک مہینہ تک یعنی جب تک جاپانیوں کے ساتھ کامیاب جھڑپ نہ ہو گئی میں کلنک کے ٹیکے کی موجودگی اور اس کے دھونے کی ضرورت کے موضوع کو جان بوجھ کر دہراتا رہا۔ چند ہی روز میں حالات سدھرنے لگے۔ کمپنی میں یکجہتی آنے لگی۔ لوگوں کے چہرے دمکنے لگے۔ خود مجھ میں بھی بشاشت آ گئی۔ میں نے کمپنی میں جانا کم کر دیا تاکہ لوگ اپنی مشکلیں خود حل کرنے کے عادی ہو جائیں۔ ہفتے میں ایک آدھ دن ناگہانی طور پر وہی ڈبل کا چکر چلا دیتا تھا۔ اس سے سرداروں سمیت سب لوگوں کے کل پُرزے زیادہ صفائی سے کام کرنے لگتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پہلے کے دیئے ہوئے حکموں کا تفصیلی جائزہ لیتا تھا۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ کہاں تک ان پر عمل ہوا ہے۔ اگر کہیں کمی رہ گئی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ کبھی کبھی سرداروں یا چھوٹے عہدے داروں یا سپاہیوں کے کسی جمگھٹے میں کسی عام دلچسپی کے موضوع پر بات یا بحث چھیڑ دیا کرتا تھا جس میں خوب گرما گرمی ہوتی تھی۔

مجھے اب احساس ہونے لگا تھا کہ کمپنی بلاشبہ ایک سونے کی ڈلی تھی جو اب تک گرد وغبار میں لپٹی رہی تھی۔ میں نے جو ذرا جھاڑ پونچھ کی تو اس کی چمک دمک واپس آ رہی تھی۔ اس سے میرے خیالات کا سلسلہ ان لوگوں کی طرف چلا گیا جنہوں نے سالہا سال اس کمپنی کی خدمت میں صرف کیے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے الہڑ رنگروٹوں کو فوجی طور طریقے سکھائے تھے۔ وہ بھی تھے جنہوں نے ان کی مزید فوجی تربیت میں حصہ لیا تھا۔ وہ بھی تھے جنہوں نے کتابیں اور پمفلٹ لکھے تھے۔ وہ بھی تھے جنہوں نے بتدریج ٹریننگ کی پالیسیاں بنائی تھیں۔ غرض بے شمار لوگ تھے جن کی اجتماعی محنت کے نتیجے میں یہ کمپنی ظہور میں آئی تھی اور اب میں نے اسے ایک دو مداری کے کرتب دکھا کر اپنا بنا لیا تھا۔ زندگی کی ریت کچھ ایسی ہی تھی۔ برسوں تک ماہر طبعیات، ماہر ریاضی اور دوسرے سائنسدان کسی ایک مسئلے کو حل کرنے میں سر پھوڑتے رہتے ہیں لیکن حل نہیں ملتا۔ پہاڑ سَر ہو گیا ہے صرف چوٹی کے چند قدم باقی ہیں لیکن اس کیلئے ہمت باقی نہیں۔ ایک تازہ دم سائنسدان آتا ہے۔ تازہ دم! اس لئے کہ پہلے آنے والوں کی برکت سے اسے بنا بنایا رستہ مل گیا ہے۔ چوٹی پر جا چڑھتا ہے اور بیسیوں سائنسدانوں کی محنت اس کے ساتھ منسوب ہو جاتی ہے۔ ملک ملک کے فنِ تعمیر کے ماہر اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا نقشہ تیار کرتے ہیں حتیٰ کہ ان کو ایک حل ملتا ہے جس میں مزید ردوبدل کی گنجائش نہیں۔ لوگوں پر ٹیکس لگا دیا جاتا ہے۔ جس سے سرکاری خزانے بھرپور ہو جاتے ہیں۔ اس روپے سے سنگِ مرمر کی کانیں کھولی جاتی ہیں۔ سینکڑوں میلوں سے پتھر سروں پر، اونٹوں پر، گدھوں پر، بیل گاڑیوں پر ڈھویا جاتا ہے۔ سنگ تراش اسے گھڑتے ہیں۔ معمار اسے مناسب جگہ پر جڑتے ہیں۔ غرضیکہ ہزاروں آدمی سالہا سال تک اس کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس دوران میں کئی ایک اہلکاروں کے کوڑوں کی مار سہتے ہیں۔ کئی پتھروں کے نیچے دب کر مر جاتے ہیں۔ کئی کیمپ کی وجہ سے پیدا ہونے والی وباؤں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ تب کہیں جا کر تاج محل تیار ہوتا ہے اور شاہجہاں کے نام منسوب ہو جاتا ہے۔ کوئی پوچھے کہ وہ ہزاروں کاریگر اور دیس کے مایہ ناز سپوت کیوں بے نام ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی برکت سے تو یہ انسانی تمدن کا شاہکار وجود میں آیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ اگر شاہجہاں اپنے وقت کے دوسرے حکمرانوں کی طرح لوگوں کا یہ روپیہ تاج محل پر خرچ کرنے کی بجائے کسی جنگ پر لگا دیتا جس سے ملک کے ملک تاراج ہو جاتے اور ہزاروں انسان تشدد کی موت مر جاتے یا خانماں برباد ہو جاتے تو کون اُس کا ہاتھ روک سکتا تھا۔ اپنی کمپنی کو بڑھتا پھولتا

دیکھ کر میں بہت دفعہ اس قسم کے خیالوں میں کھو جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں میس (Mess) میں داخل ہوا تو کرنل کو کچھ بڑبڑاتے پایا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا کیا بات ہے؟

''اوہ یہ جہنمی افریقی!''

''اِن کو کیا ہو گیا ہے''۔

''ان حرام زادوں کو تو کچھ نہیں ہوا ہمیں بھنگی سمجھ رکھا ہے۔ آج حکم آیا ہے کہ ان کا راشن کا ذخیرہ موجودہ جگہ سے چار میل نیچے لے جاؤں۔ میں لڑائی میں حصہ لینے آیا ہوں اور یہ مجھے قلی بنانے کے درپے ہیں''۔

''میں اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں؟''

''تم؟''

''جی ہاں آپ کشتیوں کا بندوبست کر دیں۔ میرے آدمی ان کو چلائیں گے اور جہاں آپ چاہیں گے ذخیرے کو منتقل کر دیں گے''۔

''بہت خوب منظور ہے''۔

میں کئی دنوں سے اپنی کمپنی کو مقامی کشتیوں کے چلانے کی مشق دینے کی فکر میں تھا لیکن کوئی صورت نہیں بنی تھی۔ آج میرا کام بھی بن گیا تھا اور کرنل بھی خوش ہو گیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں ''اراکان'' میں دریا آمدورفت کا نہایت آسان ذریعہ ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ میری کمپنی کا ہر ایک آدمی ماہر کشتی ران بن جائے۔ کرنل کے کہنے پر آس پاس کی سب کشتیاں کرائے پر جمع کر لی گئیں۔ میں نے چند مقامی آدمی اُجرت پر رکھ لئے تاکہ میرے آدمیوں کیلئے نمونہ بن سکیں اور راشن ڈھونے کا کام شروع کر دیا گیا۔ دریا میں عجب نظارہ ہوتا تھا۔ کچھ اس قسم کا جیسے گرما کی کسی سہانی شام کو لاہور میں راوی پر ہوتا ہے۔ پچاس ساٹھ کشتیاں دریا میں چاروں طرف گھومتی نظر آتی تھیں۔ کوئی ایک سمت جا رہی ہے تو کوئی دوسری جانب۔ آپس میں ٹکراؤ ہو رہے ہیں، ریس ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی ایک آدھ کشتی ڈوبنے لگتی تھی۔ بڑی مشکل سے انجان سپاہیوں کو دریا میں چھلانگ لگانے سے روکا جاتا تھا۔ پہلے ایک دو دن کام کم ہوا جبکہ شور و غوغا زیادہ۔ کوئی تیسرے دن بہت سے لوگوں نے کشتی کو سیدھا رکھنا سیکھ لیا۔ بس پھر تو کونجوں کی ڈار کی طرح کشتیاں باقاعدہ چلتی تھیں اور ڈوگرے کشتی چلاتے چلاتے پہاڑی گیت بھی گانے لگے تھے۔ کشتی رانی کی اس مشق میں ہماری دوستیاں بہت بڑھ گئیں۔

فروری 1944ء کے آخری دن تھے کہ دفعتہً کرنل نے مجھ سے دو ماہر کشتی ران مانگے۔ پتہ چلا کہ ان کا ارادہ افریقی ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں جانے کا تھا تا کہ اپنے متعلق مزید احکام حاصل کر سکیں۔ ڈویژن کوئی سو میل نیچے.......... ''کلاوان'' دریا کے کنارے میدانی علاقے میں پڑی تھی اور ملنے سے معذور تھی۔ جاپانی بھڑوں کی طرح چاروں طرف سے حملے کر رہے تھے۔ ہماری اپنی پلٹن کا نہ کسی سے وائرلیس کے ذریعے تعلق تھا نہ ٹیلیفون کے ذریعے۔ احکام و ہدایات یا تو ہوائی جہاز آ کر گرا جاتے تھے یا قاصد کے ذریعے پہنچتے تھے۔ ہم خود صرف قاصد کے ذریعے رپورٹ کر سکتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یہ رپورٹیں منزلِ مقصود تک کئی دنوں میں پہنچتی تھیں۔ ایک ماہ کے عرصہ میں ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے سوائے راشن ڈھونے کے اور کسی کام کے متعلق ہدایتیں نہیں پہنچی تھیں۔ کرنل بہت تنگ آ گیا تھا اور خود جا کر معلوم کرنے پر تُل گیا تھا کہ آخر ہماری بٹالین کا اچار کیوں ڈالا گیا تھا۔

میں نے کبیر سنگھ اور دو سپاہی کرنل کے ہمراہ کر دیئے۔ چونکہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ جانا تھا اس لیے دو دن میں کرنل ڈویژن ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ ایک دن وہاں رہ کر جرنیل کو آمادہ کر لیا کہ ہمیں میدانِ جنگ کے قریب پہنچے دیا جائے اور واپس روانہ ہو گیا۔ واپسی کے لیے ڈویژن والوں نے ایک موٹر بوٹ دے دی۔ آدھے راستے میں ''کلاوان'' کا قصبہ پڑتا تھا۔ اس کے نواح میں پہنچے تو جاپانیوں کا ایک چھاپہ مار دستہ آ نکلا۔ اس نے دریا کے دوسرے کنارے سے صرف کرنل کی کشتی پر ہی فائرنگ نہ کی بلکہ افریقیوں کے ایک پورے ہسپتال کو جو عملے اور دوائیوں سمیت رافٹوں پر سوار ہو کر نیچے جا رہا تھا تہس نہس کر دیا۔ کرنل، کبیر سنگھ اور دوسرے دونوں سپاہی کشتی کو چھوڑ کر جنگل میں گھس گئے لیکن بھاگنے سے پہلے کبیر سنگھ نے کشتی کو کھینچ کر کنارے کے ساتھ لگا دیا تا کہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہہ نہ جائے۔

کرنل اور دو سپاہی تو دو سو گز جنگل میں چل کر پھر دریا کے کنارے آ لگے لیکن کبیر سنگھ راستے سے ہی واپس ہو گیا اور جنگل کے کنارے کشتی کے عین سامنے موقعہ کی تاک میں بیٹھ گیا۔ جب سمجھ گیا کہ مناسب وقت آ پہنچا ہے تو لپک کر کشتی تک پہنچ گیا۔ اسے دھکیل کر پانی میں گیا اور اندر چھلانگ لگا کر آن کی آن میں انجن سٹارٹ کر لیا۔ اب تک جاپانیوں کی توجہ دوسری طرف لگی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے انجن کی آواز سنی تو فوراً ادھر کا رخ کیا اور فائرنگ شروع کر دی۔ مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑیں کشتی کے اردگرد پانی میں پڑتی تھیں لیکن کشتی نہ رُکی اور کرنل کے پاس پہنچ گئی۔ کرنل جو

دریا کے کنارے جنگل میں چھپا ہوا تھا یہ سارا واقعہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا بیان ہے جاپانی اِدھر والے کنارے پر آنے کی تیاری میں تھے۔ اگر کبیر سنگھ مستعدی نہ دکھاتا تو آدھے گھنٹے میں کشتی کا کھویا جانا یقینی تھا۔ کرنل اور اس کی پارٹی کا کھویا جانا بھی بعد از قیاس نہیں تھا۔ کم از کم خواری اور جنگل نوردی تو بے حد ہوتی۔ یہ ساری کاروائی کبیر سنگھ کی اپنی سوچ سمجھ اور بلند حوصلگی کا نتیجہ تھی۔ کرنل نے کوئی حکم جاری نہ کیا تھا۔

کرنل 2 مارچ 1944ء کو کبیر سنگھ کی بہادری کے راگ الاپتا ہوا بٹالین کے کیمپ میں داخل ہوا۔ مجھے یکدم حاضر ہونے کا حکم دیا۔ میں پہنچا تو کہنے لگا

''اسحاق میں تمہیں مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ بٹالین میں پہلا آدمی جو بہادری کا تمغہ حاصل کرے گا وہ کبیر سنگھ ہے باقی ڈوگروں کو بھی اطلاع دے دو''۔

اس کے بعد اس نے سب افسروں کے سامنے کبیر سنگھ کی بہادری کی روائیداد سنائی۔ رات کا کھانا ختم ہوا تو کرنل میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا ''ڈویژن کمانڈر نے ہمارا جنگ میں شامل ہونا منظور کر لیا ہے۔ لیکن یہ کنٹرول لگا دیا ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک کمپنی میدانِ جنگ میں اترے گی۔ تم کیا کہتے ہو''۔

''منظور ہے۔ میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دے دیا''۔

کرنل کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ میز پر دوسرے تین کمپنی کمانڈر بھی تھے جو سالہا سال سے اپنی کمپنیاں کمانڈ کر رہے تھے۔ ان میں سے دو میجر تھے ایک کپتان تھا اور تینوں کے تینوں انگریز تھے۔ میں محض لیفٹیننٹ تھا۔ میں اِن کے مقابلے میں کل کا چھوکرا تھا۔ ان کی کمپنیوں پر وہ حادثے بھی گزرے تھے جن سے میری کمپنی کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ نیز مجھے کمانڈ سنبھالے محض ایک مہینہ ہوا تھا۔ میں اور میری کمپنی ابھی تک ایک دوسرے کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

''دیکھو نا کبیر سنگھ کے واقعہ سے تمہاری کمپنی کی بہت چرچا ہوئی ہے اور میں نے تمہاری کمپنی کے سرداروں سے بات چیت کی ہے۔ ان کو تم پر بہت اعتماد ہو گیا ہے۔ تمہارے سپاہی بھی راستہ بھر تمہارے قصیدے پڑھتے رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی عزت ہے جو تمہیں اور تمہاری کمپنی کو مل رہی ہے''۔

باقی افسر کرنل کی نظریں بچا کر میرا منہ چڑانے لگے۔ میں بدستور مسکراتا رہا۔

''احکام کیا ہیں'' میں نے پوچھا

''فی الحال تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ تمہاری کمپنی کو قریباً چالیس دن باہر رہنا ہوگا اور اس کا کام زیادہ تر دیکھ بھال ہوگا تا کہ چھاپہ مار دستوں کو ڈویژن کے عقب میں دریا پر پہنچنے سے روکا جا سکے۔ آج کل ہوائی جہازوں کی کمی ہے اس لیے جنرل ہیڈکوارٹر نے حکم دیا ہے کہ دریا کو زیادہ سے زیادہ آمدورفت کے لئے استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر جاپانی چھاپہ مار دستے کھلے بندوں پھرتے رہے تو یہ کیسے ممکن ہو سکے گا۔ پرسوں ہی اُنہوں نے دو فیلڈ ہسپتال برباد کر دیئے۔ میری اپنی جان بڑی مشکل سے بچی۔ کل صبح تمہارے ساتھ مفصل بات چیت کروں گا''۔

میں رات بھر سوچتا رہا کہ آخر کار میری کمپنی سے پہل کیوں کی گئی۔ کبیر سنگھ کی بہادری محض بہانہ تھی۔ اس سے کمپنی کے بارے میں کچھ ثابت نہیں ہوتا تھا تو پھر یہ بہانہ ڈھونڈ کر کس چیز کو چھپایا جا رہا ہے؟! اگرچہ اس بات سے کہ یہ سربستہ راز مجھ پر کھلتا ہے یا نہیں، حالات پر کچھ اثر نہیں پڑتا تھا۔ مجھے اپنی کمپنی کو لے کر تو ہر صورت میں جانا ہی تھا لیکن مجھے کھوج بھی ضرور لگانی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کرنل کی نظر میں میری کمپنی مشکوک تھی۔ وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ عین لڑائی کے وقت اس کمپنی سے کس قسم کی حرکت سرزد ہوگی۔ آیا یہ لڑے گی یا جے ہند کا نعرہ لگا کر انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو جائے گی۔ اب وہ جوا کھیل رہا تھا۔ بٹالین کی میل کچیل باہر پھینک رہا تھا۔ یا تو یہ لڑائی کی بھٹی میں پڑ کر کندن بن کر نکلے گی یا پھر خس کم جہاں پاک۔ یہ گندگی بٹالین سے علیحدہ ہو کر ہی کہیں جلے سڑے تو بہتر تھا۔ جب میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا تو میرے دل کو اطمینان ہو گیا۔ مجھے خود بھی کمپنی پر بھروسہ نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کی کیمیا گری اگر باقیوں سے علیحدہ ہو کر ہی ہو تو بہتر تھا۔ کرنل کی طرف البتہ میرے دل میں گلہ سا پیدا ہو گیا کہ اگر بات اتنی ہی تھی تو اُسے چاہیئے تھا مجھے بتا دیتا۔

دوسرے دن صبح کرنل نے مجھے آرڈر دیئے جن کا مفہوم تھا کہ ''اپنی کمپنی یہاں سے جانب جنوب پچیس میل کے فاصلے پر ''می چانگ'' ندی کے اس پار لے جاؤ۔ (اس وقت ہم ''پلیٹوا'' کے مقام پر تھے جو ستیا نگ سے تیس میل نیچے ''کلاوان'' دریا کے کنارے پر ہے) افریقیوں نے جو سڑک بنائی ہے اس ندی پر اس کے لیے ''فیری'' تیار کی گئی ہے۔ چونکہ یہ سڑک نئی بنی ہے اس لئے یہ کہنا ممکن نہیں کہ ''فیری'' کس مقام پر ہے۔ بہرحال اس ''فیری'' سے مغرب کی طرف ایک پہاڑی ہے۔ نقشہ پر جس کی اونچائی سطح سمندر سے 53 فٹ دی گئی ہے۔ تم اس پہاڑی پر اپنا مضبوط اڈا قائم کرو۔ اس اڈے سے ایک پلاٹون پر مشتمل لڑاکے پٹرول چالیس میل دور جانب جنوب مشرق

بھیجتے ہیں تا کہ اس جگہ واقع پہاڑی راستوں کی خبر گیری کریں اور ان جاپانی چھاپہ مار دستوں کی روک تھام کریں۔ جاپانی فوجی اس طرف سے افریقی ڈویژن کے عقب میں آنے کی کوشش کرنا چاہیں تو یہ پلاٹون اس علاقے میں (نقشے پر کوئی دس میل پہاڑی جنگلاتی علاقے پر اُنگلی پھیر کر) ڈیرے جمائے گی اور کاروائی کی جگہ پر آنے جانے کے وقت کے علاوہ دس دن رہے گی۔ باری آنے پر دوسری پلاٹون اسے اسی جگہ فارغ کرے گی۔ اس طرح تمہاری تینوں پلاٹونوں کو اپنا کام ختم کرنے کے لیے ایک ماہ سے کچھ اوپر درکار ہوگا۔

''باقی آدمی جو تمہارے پاس بچیں۔ ان کے ساتھ تم نے ''می چانگ'' ندی پر فیری کی حفاظت کرنی ہے تا کہ اگر بٹالین کو ندی پار کرنی پڑے تو جاپانی مزاحمت نہ کر سکیں، ہاں، وہیں کہیں افریقیوں کا کپڑے کا ذخیرہ ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں پیراشوٹ ہیں۔ دیکھنا کہیں برمی لوگ اس ذخیرے کو لُوٹ نہ لیں۔ موقع ملنے پر کسی ذریعے سے یہ پیراشوٹ ''دوہزاری'' واپس پہنچاتے ہیں۔ لیفٹیننٹ بائڈ (ایک انگریز) تمہارے ساتھ جائے گا اور سب سے پہلے پلاٹون کا لڑاکا پٹرول لے کر وہی نکلے گا''۔

''ٹھیک ہے''۔

''آج کل محاذِ جنگ کی کیا حالت ہے؟''

تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہمارا نہ وائرلیس کے ذریعے کسی کے ساتھ ملاپ ہے نہ ٹیلی فون کے ذریعے۔ قاصد یا ہوائی جہاز کے ذریعے جو ڈاک آتی ہے اسی پر دارومدار ہے۔ سو وہ اب کئی دن سے آئی ہی نہیں۔ 29 فروری کو جب میں ڈویژن ہیڈکوارٹر سے چلنے لگا ہوں اس وقت یہ حالت تھی کہ ڈویژن کا آگے کی طرف ایڈوانس بالکل رک گیا تھا اور جاپانی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اس وقت تک اندازہ تھا کہ جاپانی ڈویژن کے عقب میں نہیں پہنچے تھے اور یہ کہ دریا کا راستہ محفوظ تھا۔ ''موضع کلاوان'' کے حادثے کے بعد اب تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا اور میں تمہیں کیا بتاؤں''؟ ''اس ایک مہینے میں آپ کہاں ہوں گے؟''

''میں بٹالین کو یہاں سے پندرہ میل آگے لے جا رہا ہوں یعنی ہم تم سے دس میل پیچھے ہوں گے۔ چھوٹے وائرلیس سیٹوں پر اتنے فاصلے پر ملاپ مشکل ہے۔ لیکن بہرحال اپنا کمپنی سیٹ ساتھ لے جاؤ۔ کسی اونچی جگہ لگا دینا۔ ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ ملاپ کے لئے روزانہ چار آدمیوں کا ایک پٹرول تمہاری طرف بھیجتا رہوں گا''۔

''میرا اپنی باہر جانے والی پلاٹون کے ساتھ ملاپ کیسے ہوگا؟ آپ دو مزید سیٹ دے سکتے ہیں؟''

''میں نے سگنل آفیسر سے دریافت کیا تھا اس کے پاس فالتو سیٹ نہیں ہیں''۔

''یہاں تو اس قسم کا علاقہ ہے کہ اس جگہ سے سو گز کے فاصلے سے دشمن کا پورا بریگیڈ گزر جائے تو ہمیں کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایک پلاٹون کے لیے دس میل کا علاقہ کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتا ہے''۔

''کیوں؟'' اور کرنل سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اب تک شمالی افریقہ کے محاذ پر لڑتا رہا تھا جہاں کے لق و دق صحراؤں میں ایک پلاٹون دس میل تو کیا بیس میل تک کے علاقے کی دیکھ بھال کر سکتی تھی بشرطیکہ اسے مناسب گاڑیاں مل جائیں۔ یہاں جنگل میں نہ گاڑیاں چل سکتیں تھیں نہ دوربینیں کام کرتی تھیں۔ اندھے کی ڈگوری تھی لگ گئی لگ گئی نہ لگی نہ لگی''۔

''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے ایک مہینے کا پروگرام محض تکلف ہے۔ ''کلاوان'' کا قصبہ جہاں آپ پر فائرنگ ہوئی تھی ''می چانگ'' کے کنارے میرے اڈے سے کوئی دس میل کے لگ بھگ ہوگا۔ جاپانیوں کو وہاں اتنا موٹا شکار مل چکا ہے وہ ایسی جگہ کہاں چھوڑنے والے ہیں۔ میرے آدمیوں کی ان کے ساتھ راستے میں ہی کہیں مڈھ بھیڑ ہو جائے گی''۔

''دیکھو اسحاق بات یہ ہے کہ ان سب معاملات کے بارے میں مَیں بھی اتنا کچھ ہی جانتا ہوں جتنا تم جانتے ہو۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ یہ سب مسئلے تمہارے ذہن میں ہیں اور تم نے ابھی سے ان کے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے اپنی بٹالین کیلئے جنگ کی ڈیوٹی ڈویژن کمانڈر سے چھین کر لی ہے۔ اس دن جو میں ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں ناگہاں جا دھمکا تھا تو ان لوگوں نے خیر مقدم کرنے کی بجائے ناک بھوں چڑھائی تھی۔ وہ لوگ ہماری بٹالین کو غیر ضروری ذمہ داری سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو تنگ کرنے کی بجائے ہم یہاں بیٹھے مزے سے راشن کھائیں اور خوش رہیں۔ ڈویژن کمانڈر پہلے تو مجھے ملتا ہی نہیں تھا۔ میرے اصرار پر جب ملا تو چھوٹتے ہی پوچھا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ میں ایک کمپنی سے زیادہ ایک وقت میں استعمال کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اس اچانک سوال کا جو الٹا سیدھا جواب مجھ سے بن پڑا وہ تمہارے سامنے ہے۔ دراصل افریقی ڈویژن کی حالت پتلی ہے۔ جاپانیوں کے مقابلے میں ان کے سب تجربے ناکام ہو چکے ہیں۔ تم جانتے ہو اتنا عرصہ لڑنے کے بعد ان کو اب تک ایک مردہ جاپانی نہیں ملا۔ ہاں اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ اگر ان میں سے کوئی کسی جاپانی کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا، جیسے بھی ہو مردہ یا زندہ، تو اسے میں بہت بڑا انعام دلواؤں گا۔ تین انچ دہانے کی مارٹر لے جاؤ گے''۔

''جی ہاں، دو دے دیں''۔

''کب چلو گے؟''

''کل صبح اس وقت''

''شاباش'' اور ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میں کرنل کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میں وہاں سے نکل جاؤں۔ آگے میں جانوں اور میرا کام۔ مجھے یہ بندوبست منظور تھا۔ البتہ اس خیال سے دل بھاری ہو جاتا تھا کہ جس طریقہ سے میری کمپنی کو لڑنا پڑ رہا تھا وہ بہت بے ہنگم تھا۔ کمپنی بٹالین سے پچیس میل آگے جبکہ پلاٹونیں، اس سے بھی چالیس میل آگے۔ کسی کے ساتھ تعلق نہ واسطہ۔ وائرلیس تک کا ملاپ نہیں۔ ایسی سکیمیں تو ٹریننگ کے دوران بھی شاذ و نادر ہی بنائی جاتی تھیں۔

3 مارچ کا دن بندوبست میں گزر گیا۔ گھنٹہ بھر کی ضرب تقسیم کے بعد کمپنی کی راشن اور ایمونیشن کی ضروریات کا اندازہ لگا لیا گیا اور کوارٹر ماسٹر سے یہ سامان لینے کا بندوبست ہو گیا۔ 3 انچ دہانے کے دو مارٹر اور ان کی ٹیمیں اکٹھی کیں۔ سگنل پلاٹون سے ایک وائرلیس کی ٹولی (Detachment) لی اور میڈیکل اردلی بھی لیا۔ اپنے لئے آفیسر میس سے ایک باورچی اور کھانے کے برتن لئے۔ چار خچر خچروں والی پلاٹون سے منگوا لیے وغیرہ وغیرہ۔ شام تک تیاری مکمل ہوگئی۔ کرنل کا میدان جنگ کا سیکنڈ ان کمانڈ Battle Second Command ایک انگریز میجر تھا، اُسے میرے ساتھ لگا دیا گیا۔ میں جو چیز مانگتا وہ مہیا کر دیتا تھا۔ ان دنوں مَیں کرنل کا بہت لاڈلا تھا۔

4 مارچ کی صبح کو ہم نے کوچ کر دیا۔ کرنل دور تک میرے ساتھ آیا۔ الوداع کہتے وقت بہت گرم جوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہنے لگا۔ ''اسحاق آج مَیں تم پر رشک کر رہا ہوں تمہیں دیکھ کر دل چاہ رہا ہے کہ کاش میں بھی جوان ہوتا اور اپنی کمپنی کو میدان جنگ کی طرف لے جاتا۔ میری جوانی زمانہ امن میں ہی گزر گئی۔ بٹالین کی کمان میں وہ مزہ کہاں جو کمپنی کی کمان میں ہے۔ اچھا خدا تمہارا نگہبان ہو''۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میرے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو سارا دن چلتے رہیں اور شام کے جھٹپٹے میں ''می چانگ'' کے کنارے جا رہیں یا رات راستے میں گزار دیں اور پانچ کی صبح کو منزل مقصود کو جا لیں۔ پہلی صورت میں ایک تو ہم اندھیرے میں کیمپ کرتے جو کہیں بھی خاص کر جنگل میں مناسب نہیں سمجھا جاتا۔

اصول یہ ہے کہ سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے کیمپ کر لیا جائے۔ دوسرے سپاہی دن بھر کے مارچ کے بعد تھکے ماندے ہوتے ہیں اور رات دشمن کے کسی چھاپہ مار دستے سے مڈھ بھیڑ میں درگت بن جاتی۔ اس لئے میں نے دوسری صورت اختیار کر لی اور کوئی بیس میل چل کر ایک مناسب مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔ کمپنی سے ابھی تک سہل روی کی عادت نہیں گئی تھی۔ ہر پچاس منٹ چلنے کے بعد جب دس منٹ کا مقام ہوتا تھا تو سپاہی چلتے چلتے آٹے کی بوری کی طرح اپنی جگہ گر پڑتے تھے۔ ایک دو ہالٹ تو ایسے گزر گئے لیکن اس کے بعد میری قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ میں نے سرداروں کو بلایا اور بہت ڈانٹ ڈپٹ کی کہ ہم دشمن کے علاقے میں پھر رہے ہیں لیکن آپ سمجھ رہے ہیں کہ کسی تیرتھ یاترا کو جا رہے ہیں۔ برائے مہربانی ہوشیاری سے کام لیں۔ چنانچہ جب ہالٹ ہوتا تھا تو کمپنی کی تینوں پلاٹونیں سیکشن وار اس طرح پوزیشن لے لیتی تھیں کہ دشمن کسی طرف سے بھی آئے وہ تیار چوکس ہیں۔

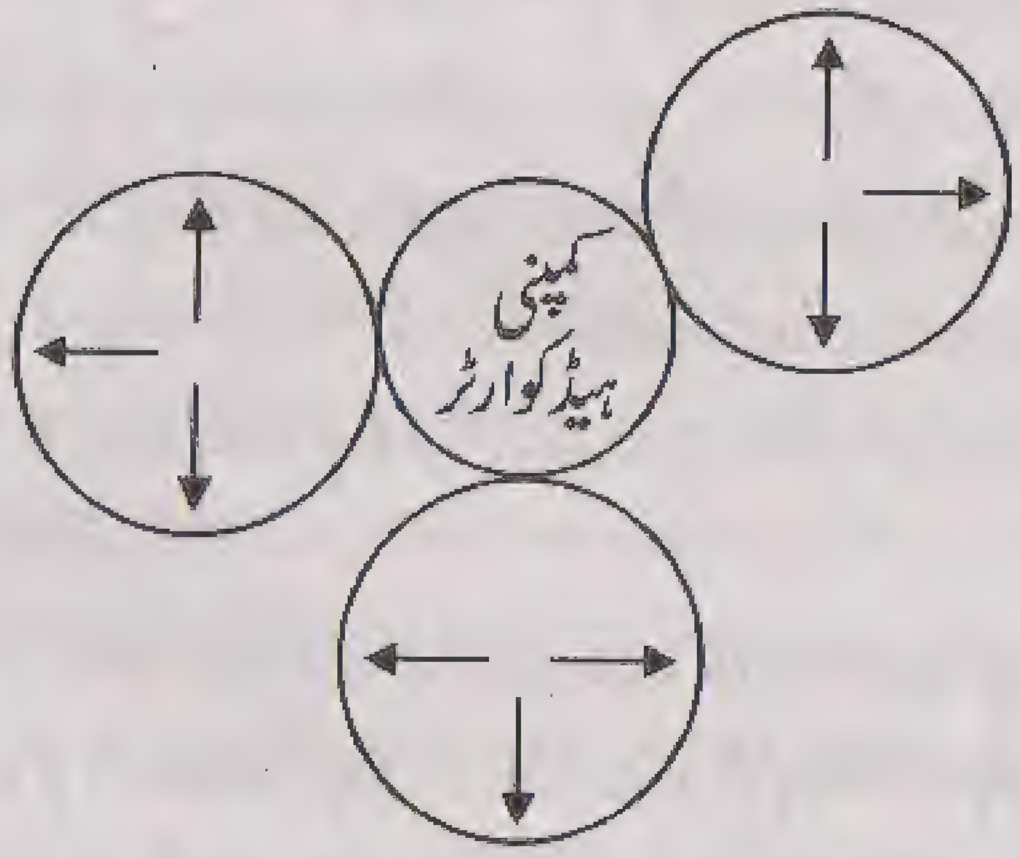

5 مارچ 1944ء صبح سویرے "می چانگ" کے کنارے پہنچ گئے۔ ندی پر "فیری" موجود تھی۔ یہ ندی مشرق سے مغرب کو بہتی تھی "کلاوان دریا" میں "کلاوان" گاؤں سے پانچ چھ میل شمال کو آملتی ہے۔ فیری دریاؤں کے سنگم سے کوئی پانچ یا چھ میل مشرق کو تھی۔ یہاں پر ندی میں سمندر کے جوار بھاٹے کا اثر تھا۔ نقشہ پر سے کرنل اور میں نے زمین کا جس قسم کا اندازہ لگایا تھا یہاں اس سے

حالت مختلف تھی۔ اصل میں کوئی خاص فرق بھی نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ نئی سڑک 503 فٹ بلند پہاڑی کے نیچے سے گزرنے کی بجائے کوئی ہزار گز مشرق کو ہٹ کر گزر رہی تھی۔ مجھے حکم تھا کہ 503 فٹ بلند پہاڑی پر اپنا اڈا قائم کرو۔ فیری کے مقام سے جب میں اس پہاڑی کی طرف دیکھتا تھا تو یہ اپنی اونچائی کی وجہ سے ہوا میں لٹکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ پہاڑی اس قدر وسیع تھی کہ ایک کمپنی کا اس پر پورا قبضہ جمانا ناممکن تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ چوٹی پر چڑھ کر پوزیشن لی جائے مگر ایسی صورت میں پانی کی ضرورت کے لیے چار پانچ سو فٹ نیچے اترنا پڑتا تھا اور اس چار پانچ سو فٹ کی اترائی میں جاپانی کہیں بھی بیٹھ کر ناکہ بندی کر سکتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہاں سے فیری کی حفاظت ناممکن تھی۔ "می چانگ" کے جنوب میں فیری اور 503 فٹ والی بلندی کے درمیان "می زاوا" کا گاؤں تھا جس کے مکانوں اور آموں کے بڑے بڑے پیڑوں نے فیری کو مغرب کی طرف سے ڈھانپ رکھا تھا۔ "می زاوا" کے جنوب میں کوئی ایک میل لمبا اور ایک ہزار گز چوڑا میدان تھا جس کے درخت کاٹ کر اسے ہوائی جہازوں سے سپلائی گرانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ یہیں وہ ذخیرہ تھا جس میں کپڑوں، ربڑ کے جوتوں اور پیراشوٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور جس کی حفاظت میرے ذمے لگائی گئی تھی۔ فیری اور اس میدان کے مشرق میں فیری سے ملتی ہوئی ایک اور پہاڑی تھی۔ یوں کہیئے کہ پتلی پتلی اور ایک جیسی بلندی کی پہاڑیوں کی طرح سطح مرتفع تھی۔ یہ پہاڑیاں دریا سے شروع ہو کر جنوب کی طرف میلوں تک چلی گئی تھیں۔ نقشے پر ان کی اوسط اونچائی سطح سمندر سے دو سو فٹ دی گئی تھی۔ لیکن یہاں دریا کی سطح سے ان کی اونچائی پچاس اور سو فٹ کے درمیان ہوگی۔ یہ پہاڑیاں بارہ فٹ سے لے کر بیس فٹ اونچے بانس کے گھنے جنگل سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں پہاڑیوں کے درمیان نالوں میں اونچے اونچے درخت بھی تھے۔

میں فیری کے ساتھ والی پہاڑی پر پہلی ہی نظر میں فدا ہو گیا۔ یہ میرے کام کے لیے نہایت موزوں تھی۔ اگرچہ یہ بلندی میں 503 فٹ والی پہاڑی سے بہت کم تھی لیکن اس کے ارد گرد اس سے اونچی کوئی اور پہاڑی نہ تھی جہاں سے ان پر چھوٹے ہتھیاروں سے گولیاں یا گولے برسائے جا سکیں۔ فیری پر قبضہ رکھنے کے لیے اس پہاڑی پر قبضہ اشد ضروری تھا۔ یہاں دشمن کے گھیرے میں آنے کا خطرہ بھی بہت کم تھا اور مشکل وقت میں دریا کو آسانی سے پار کیا جا سکتا تھا۔ دریا بالکل ساتھ بہہ رہا تھا اس لئے پانی کی تکلیف بھی نہیں تھی۔

اب میرے سامنے سوال یہ تھا کہ کرنل کے حکم پر لفظ بلفظ عمل کروں یا اس کے مقاصد کو سامنے رکھ کر

جو بہتر صورت نظر آئے اسے قبول کروں۔ میں نے دوسری بات اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے سرداروں اور دوسرے عہدیداروں کو ساتھ لے کر فیری کے ساتھ والی پہاڑی پر چڑھ گیا۔ وہاں دیکھا کہ یہ پہاڑی اوپر سے تقریباً پچاس فٹ چوڑی تھی۔ کوئی آٹھ سو گز جنوب میں اس کی دو شاخیں ہوگئی تھیں۔ ان کے آگے جاکر اور شاخیں بن گئیں تھیں۔ اس پہاڑی (جسے دراصل رج (Ridge) کہنا چاہیے) کے مغرب میں جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ''می زاوا'' کا گاؤں اور اس کے ساتھ والا میدان تھا اور مشرق میں ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ ''می زاوا'' گاؤں سے ایک پگڈنڈی پہاڑی کے دریا والے سرے کے اوپر سے ہوکر ''می چانگ'' کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ مشرق کو چلی گئی تھی۔ میں نے اپنی کمپنی کی پوزیشن اس پگڈنڈی سے کوئی بیس گز جنوب کی طرف ہٹا کر لگائی۔ تاکہ کوئی بھولا بھٹکا راہگیر ادھر آ نکلے تو ہماری کمپنی کی اندرونِ خانہ کارروائیوں کی اطلاع نہ پاسکے (یہ مجھے یقین تھا کہ جس گاؤں والے کو ہمارے وہاں ہونے کی اطلاع ہوگی وہ اس راستے سے آنا جانا چھوڑ دے گا۔ تاہم حفظ ماتقدم ضروری تھا) اس طرح سے دریا سے ملتا ہوا پہاڑی کا شمالی سرا کوئی چالیس گز تک خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہاں میں نے ایک سیکشن پر مشتمل سٹینڈنگ پٹرول (Standing Patrol) لگادیا تھا۔ ان کو حکم تھا کہ دریا اور اس کے پار کے علاقے کی دیکھ بھال کریں اور فیری کی حفاظت کریں۔ دشمن کا حملہ ہونے کی صورت پیدا ہوتی نظر آئے تو کمپنی پوزیشن میں آجائیں۔ ایک اور سٹینڈنگ پٹرول جو چار آدمیوں پر مشتمل تھا کمپنی پوزیشن سے جنوب میں کوئی آٹھ سو گز کے فاصلے پر لگادیا گیا۔ یہ دونوں پٹرول صرف دن کے لیے تھے رات کے وقت ان کو واپس آجانے کا حکم تھا۔

کمپنی کی مین پوزیشن (Main Position) بیضوی شکل کی تھی جبکہ خندقیں پہاڑی کی چوٹی کے کناروں سے ذرا ہٹ کر کھودی گئی تھیں۔ گنجے آدمیوں کی ''ٹنڈ'' بالکل خالی ہوتی ہے لیکن ڈھلوان میں گھنے بال ہوتے ہیں۔ ہمارے مورچوں کی پوزیشن وہی تھی جہاں یہ ڈھلوان کے بال شروع ہوتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ دشمن کی گولہ باری اگر چوٹی پر گرے تو اس سے جانی نقصان نہیں ہوتا۔ اگر چوٹی سے ہٹ کر گرے تو گولے عموماً بہت نیچے جاکر پہاڑی کے اردگرد کی نشیبوں میں جا پھٹتے ہیں۔ اگر دشمن ہلّہ بول کر بنفسِ نفیس پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ آئے تو نیچے خندقوں میں بیٹھے ہوئے سپاہی ایک دوسرے کو نقصان پہنچائے بغیر اندر کی طرف فائرنگ کر کے اس کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔ ایک طرف ڈھلوان میں 3 انچ دہانے کی مارٹروں کیلئے گڑھا کھود دیا گیا۔ دوسری طرف

چاروں خچروں کیلئے جگہ بنادی گئی۔ لنگر نیچے نالے میں بنائے تاکہ دھواں وہیں جھاڑیوں اور بانسوں کی جڑوں میں پھیل جائے اور سیدھا اوپر اُٹھ کر ہماری پوزیشن کا نشان نہ دے۔

اس دن بھی سرداروں نے حسبِ معمول خواہش ظاہر کی کہ پانچ کا دن دریا کے کنارے گزارا جائے اور چھ کی صبح کو پہاڑی پر پوزیشن لی جائے۔ وجہ یہ پیش کی کہ چھ کی صبح کو پٹرول پر جانے والی پلاٹون کے تین دن کے سفر کیلئے گلگلے تیار کرنے تھے۔ نیز اس میں سہولت تھی نیز لوگ تھکے ہوئے تھے۔ چھ کی صبح تک تازہ دم ہوجاتے تو بہتر تھا۔ میں نے اس تجویز کو یکسر نامنظور کردیا۔ اب ہم ایسے علاقے میں تھے جو جاپانیوں کے چھاپہ مار دستوں کی زد میں تھا۔ نیز جو کام شام کو ہوسکتا تھا اسے مجھے دوسری صبح پر چھوڑنے میں سخت گھن آتی تھی۔ میری ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ صبح سویرے میری آنکھ جس ماحول میں کھلے اس میں شانتی ہو۔

پانچ کی شام کو میری دو کشتیاں بھی پہنچ گئیں جن میں ریزرو راشن اور ایمونیشن تھا۔ اب میرے پاس ایک پلاٹون کے لیے سولہ 16 دن اور باقی کمپنی کے لیے آٹھ مارچ تک کا راشن موجود تھا۔ کرنل نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دو دن میں مزید راشن اور ایمونیشن بھیج دے گا۔

پانچ مارچ کو جو آٹا کشتیوں میں آیا تھا اس میں ایک بوری بھیگی ہوئی نکلی۔ میں نے مناسب خیال کیا کہ می چانگ ندی میں کوئی اچھی سی جگہ ڈھونڈ کر اس بوری کو وہاں ڈال دیا جائے تاکہ جب بہت سی مچھلیاں آٹا کھانے کو جمع ہوجائیں تو ان کا شکار پانی میں گرنیڈ (Grenade) استعمال کر کے کیا جائے۔ یہ مچھلی پکڑنے کا ایک بہت ظالمانہ طریقہ تھا۔ ظالمانہ اس لئے کہ اس طریقہ سے جتنی مچھلیاں ہاتھ آتی ہیں ان سے کہیں زیادہ دستیاب نہیں ہوتیں۔ ان میں کئی ایک تو نیم جان رہ جاتی ہیں۔ ظالمانہ اس لئے بھی کہ اس قتلِ عام سے دریا میں مچھلیوں کی تعداد بہت کم ہوجاتی ہے۔ ہزاروں ایسی مچھلیاں ضائع ہوجاتی ہیں جن کو انسان کے استعمال کے قابل ہونے میں ایک، دو یا تین سال باقی ہوتے ہیں۔ اس لئے دریا کے کنارے رہنے والے لوگ کئی سال تک مچھلیوں سے محروم ہوجاتے ہیں۔ لڑائی میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہوتی ہے۔ مچھلیاں تو ایک طرف یہاں انسان انسان کے درپے آزار ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس لڑائی میں فسطائی ظالموں نے تو اپنے علاوہ باقی انسانی نسل کو بھیڑ بکریاں سمجھ رکھا تھا۔ دنیا کے انسانوں کا سب سے مقدم اخلاقی فرض تو یہ ہے کہ اس کرۂ زمین پر انسانی نسل قائم رہے۔ جو چیز بھی اس اولین فرض کے خلاف کام کرتی ہے اس کا دفاع کرنا بھی اس فرض کا حصہ ہے۔ خواہ یہ چیز فرعونیت ہے یا زاریت، فسطائیت ہے یا

جاگیرداری، ٹڈی دل ہے یا ہائیڈروجن بم۔ ملیریا کے مچھر ہیں یا بیماری پھیلانے والی مکھیاں، انگلستان کے جنگلی خرگوش ہیں یا ہندوستان کے آوارہ کتے اور بندر۔ مجھے یاد نہیں جب میں مچھلیوں میں گرنیڈ پھینکتا تھا تو اس لحاظ سے اپنے آپ کو ظالم سمجھتا تھا یا نہیں کہ اس سے دوسرے انسانوں کی روزی کو نقصان پہنچتا ہے۔ بزعم خود اپنی اس اختراع سے البتہ بہت خوش ہوا کرتا تھا کہ گرنیڈ بھی انسان کو مارنے کی بجائے انسان کی پرورش کے کام آسکتے ہیں۔

دریا کا معائنہ کرنے کے لیے صبح سویرے ہی اٹھ کر پہاڑی سے نیچے اتر آیا اور دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔ میں محض پتلون قمیض پہنے ہوئے تھا اور میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اردلی میرے پاس آیا اور اطلاع دی کہ باہر جانے والی پلاٹون تیار ہے اور محض آپ کے معائنے کا انتظار ہے۔ میری طبیعت پر بہت سستی چھائی ہوئی تھی اس لئے کہلا بھیجا کہ اگر پلاٹون کے افسر مطمئن ہیں اور ان کو میری طرف سے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے تو وہ روانہ ہو جائیں۔ اتنے میں لیفٹیننٹ بائڈ خود تشریف لے آئے اور مجھے رپورٹ کی کہ وہ اور ان کی پلاٹون اپنے سولہ دن کے دورے کے لیے تیار ہے۔ میں نے ان سے بھی یہی بات کہی جو اردلی سے کہہ چکا تھا اور وہ بھی پلاٹون کو لے کر چلے گئے۔

''مزادا'' کے گاؤں میں مَیں نے کچھ ہل چل دیکھی۔ لوگ جلدی جلدی اپنا سامان نکال کر کشتیوں میں ڈال رہے تھے اور کہیں دوسری جگہ لے جا رہے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ چونکہ ہم نے ان کے پاس ہی ڈیرے جما دیئے تھے اس لئے آئندہ ہماری اور جاپانیوں کی کسی متوقع جھڑپ میں نقصان کے خوف سے گاؤں چھوڑ رہے ہوں گے۔ لیکن اپنی ماہی گیری کی دُھن میں مَیں نے دو باتوں کا خیال نہ کیا۔ اگر اس وقت ان دو باتوں پر پوری توجہ سے سوچتا تو شاید اپنی ایک پلاٹون کے تانے بانے کو درہم برہم ہونے سے بچا سکتا۔ پہلی بات یہ تھی کہ ہمیں وہاں آئے ہوئے کوئی بیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ اگر گاؤں والوں کو ایسے خدشے تھے تو وہ پانچ مارچ ہی کو گاؤں چھوڑ کر کیوں نہ چلے گئے یا پانچ اور چھ مارچ کی درمیانی رات کو چھوڑ جاتے بلکہ پانچ مارچ کی شام کو گاؤں کا نمبردار مجھے ملنے کیلئے آیا تھا۔ کچھ اُردو، کچھ انگریزی اور زیادہ تر برمی میں، بہت سے اشاروں سے ہمیں خوش آمدید کہا تھا۔ یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس وقت تک وہ افریقی ڈمپ (Dump) کی حفاظت کرتا رہا تھا۔ دوسری بات جس پر مجھے پہلی بات سے بھی زیادہ دھیان دینا چاہیے تھا وہ یہ تھی کہ ان لوگوں کو اتنی گھبراہٹ کیوں تھی۔ لیکن میں اپنی جبلی کاہلی کے طفیل دریا پر بیٹھا ادھر اُدھر

آٹے کا چھان دیتا رہا تا کہ مچھلیوں کی تعداد اور ان کے سائز کا کچھ اندازہ لگا سکوں۔

پلاٹون کو نکلے کوئی ایک گھنٹہ ہوا ہوگا کہ مجھے گرنیڈوں کے پھٹنے، اپنی اور جاپانیوں کی ہلکی مشین گنوں، رائفلوں، ٹامی گنوں کے ایک دم چلنے کی آوازیں آئیں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ گاؤں والے کیوں اتنی جلدی میں تھے۔ ان لوگوں کے اپنے خاص ذریعے ہوتے ہیں جن سے وہ اپنے نواح کی خبریں آنکھ جھپکنے میں حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بات بالکل صاف ہو گئی تھی کہ ان کو اپنے علاقے میں جاپانیوں کی موجودگی کی اطلاع چھ کی صبح کو ہو گئی تھی۔ مجھے ان سے کچھ گلہ سا ہو گیا تھا۔ اول تو اسلئے کہ زبان کی مشکلات کی وجہ سے میرے پاس ان لوگوں سے اطلاعات حاصل کرنے کے خاطر خواہ ذرائع نہ تھے اور دوسرے وہ غیر ملکی حملہ آوروں میں سے انگریزوں کو پسند کرنے کی ان کے پاس ابھی تک کوئی دل لگتی وجہ نہ تھی۔ بہر حال میں نے دریا سے کمپنی پوزیشن کی طرف چلتے چلتے مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ مقامی لوگوں کی بے چینی سے دشمن کی موجودگی کا اندازہ لگانے میں کوتاہی نہیں کروں گا لیکن ''مشتے کہ بعد از جنگ یاد می آید برکلہ خود باید زد''۔ ایسا موقع کبھی ہاتھ نہ آیا اس لئے کہ اس کے بعد مقامی باشندے جاپانیوں کے آنے کا انتظار نہیں کیا کرتے تھے بلکہ جونہی دیکھتے تھے کہ ہم نے ان کے گاؤں کے آس پاس ڈیرے ڈال دیئے ہیں وہ اپنے ڈیرے اٹھا لیا کرتے تھے۔

میدان جنگ میں رہنے والے یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ جن لوگوں کے گھر بار کو میدان جنگ بنا دیا جائے ان کی جو درگت بنتی ہے وہ جنگ میں حصہ لینے والی فوجوں کی بھی نہیں بنتی۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے، بیمار، تندرست سب اپنی جان و مال اور آبرو ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں۔ فوج والے جو ظلم چاہیں روا رکھیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ اگر ایک طرف کی فوج والوں کی مدد نہ کریں تو وہ ان کو دشمن سمجھتے ہیں اور اگر امداد دیں تو دوسری فوج والے انہیں اپنے دشمنوں کی صف میں شمار کرتے ہیں۔ انگریزوں کے بارے میں اتنا کہوں گا کہ وہ اگر ظلم بھی کرتے تھے تو اس کیلئے پہلے قانون پاس کر لیا کرتے تھے تا کہ اس کی انتہائی حدود کا تعین ہو سکے اور سب جگہ لوگ ایک ہی قسم کا ظلم کریں۔ ہمیں نہایت واضح طریقے پر بتایا گیا تھا کہ مقامی باشندوں کی بہو بیٹیوں کی بے حرمتی نہ ہو۔ کسی کا مال نہ چھینا جائے۔ ہم مقامی لوگوں کو مزدوری کیلئے مجبور کر سکتے تھے لیکن باقاعدہ معاوضہ دینا پڑتا تھا اور جہاں جان کا خطرہ ہوتا تھا وہاں مزدوری کیلئے مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔ زمانہ امن میں بھی جہاں کہیں بہت سے اجنبی اکٹھے ہو جائیں ان کو ایک دوسرے سے بہت سے گلے شکوے ہو جاتے

ہیں۔ جنگ کے حالات تو نہایت غیر معتدل ہوتے ہیں ان میں غیر ملکی فوجیوں اور مقامی باشندوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہو جانا معمولی بات ہے۔ انگریزوں کے حق میں اتنا کہنا پڑتا ہے کہ مقامی باشندوں کی طرف ان کا رویہ نہایت دانشمندانہ اور دور اندیشی پر مبنی تھا۔ برما کے باشندوں نے 1942ء میں جبکہ انگریز ملک سے بھاگ رہے تھے جاپانیوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ایشیائی بھائی ان کو دشمنوں کے چنگل سے نجات دلانے آئے ہیں۔ لیکن جاپانی فسطائیوں نے بہت جلد ان کے ذہن نشین کر دیا تھا کہ فسطائیوں کی نظر میں ان کے لیے اپنے ملک کے اونچے طبقے کے علاوہ جاپانی غیر جاپانی سب چرند پرند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اونچے طبقے کی خاطر مقامی لوگوں کو ذبح تک کر دینا جائز ہی نہیں بلکہ ایمان کی مضبوطی کی نشانی ہے۔ چنانچہ ایک دو سال میں ہی برمی عوام جاپانیوں سے نفرت کرنے لگے تھے اور اب کی بار جب انگریز دوبارہ ملک میں داخل ہو رہے تھے تو ان کی نظروں میں بھلے نہیں تو بُرے بھی نہیں تھے۔

مقامی باشندوں کے بارے میں مَیں یہاں بہت کچھ لکھ گیا ہوں۔ حقیقتاً اس وقت میں نے ان کو بہت کم توجہ دی تھی۔ میرے کان اس فائرنگ کی طرف تھے جو دس بارہ منٹ کے جوش و خروش کے بعد اب بالکل بند ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ ایک ہی ہو سکتا تھا یا تو جاپانی پلڑا چھڑا کر بھاگ گئے یا پھر میرے آدمی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے آ رہے تھے۔ ورنہ اس طرح خاموشی نہ چھا جاتی کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں جب دریا سے اُٹھ کر کمپنی پوزیشن کی طرف آ رہا تھا تو میری باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ میں خود حیران تھا کہ اتنی مسرت کہاں سے آ گئی۔ لیکن اس خوشی کی کئی ایک وجوہات تھیں مثلاً یہ کہ میری پلاٹون کو ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہی دُشمن کا اتہ پتہ مل گیا تھا اور میرے بچے کھچے آدمی میرے پاس پہنچ سکتے تھے۔ اگر ان کی دشمن کے ساتھ ایک دن یا دو دن یا تین دن کے سفر کے بعد مڈبھیڑ ہوتی تو کسی آدمی کا بچ کر نکل آنا محال تھا۔ دوسری وجہ مسرت کی یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ مَیں دشمن کو ڈھونڈتا دُشمن مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ میرا اس کا مقابلہ ایسی جگہ ہونے والا تھا جو خود میری پسند کی ہوئی جگہ تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ حصے بخرے ہونے کی بجائے ساری کمپنی میرے پاس تھی (ایک پلاٹون کے قسمت کے فیصلے کی ابھی تک مجھے اطلاع نہیں ملی تھی لیکن اندازہ تھا کہ اس مختصر جھڑپ میں اس کا زیادہ نقصان نہیں ہوا ہوگا) اور ہم سب مل کر دشمن کا مقابلہ کرنے والے تھے۔ موڈ کی بات بھی ہوگی بہر حال میں خوش بہت تھا۔ میں نے اس خوشی کی وجوہات بیان کر دی ہیں لیکن اس

وقت میرا دھیان وجوہات کی طرف نہیں تھا۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ جیسے مجھے کشف ہوا ہو کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں اپنی بہتری ہی بہتری ہے۔

؎ عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

ترجمہ: دشمن ایسا شر پیدا کرتا ہے جو ماں کی محبت بن جاتا ہے۔

جب میں کمپنی پوزیشن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ لوگ دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں کہ جیسے پوچھ رہے ہیں "اب کیا ہوگا"۔ میں نے سرداروں اور عہدہ داروں کو اکٹھا کیا اور خود ان کے آگے یہ مسئلہ رکھ دیا کہ وہ صلاح مشورے کے بعد مجھے بتائیں کہ کیا کرنا چاہیئے۔ کچھ آدمیوں نے فوراً رائے دی کہ ہمیں اس معاملے میں وہی کچھ کرنا چاہیئے جو ہماری فوج جاپانیوں کے مقابلے میں اب تک کرتی آئی تھی یعنی پسپا ہو جائیں بلکہ فوراً نو دو گیارہ ہو جائیں۔ میں نے پوچھا کہ ایک پلاٹون جس نے جاپانیوں سے جھڑپ لی تھی اور جواب تک واپس نہیں آئی ہے اس کا کیا بنے گا۔ جواب ملا۔ سارا دھن جاتا دیکھو آدھا دیؤ لٹا۔ ایک دوسری جماعت نے مشورہ دیا کہ غیر حاضر جماعت کی طرف سے اطلاع کا انتظار کرنا چاہیے کہ صورتحال کیا ہے۔ پہلی جماعت نے جواب دیا اس وقت تک جاپانی پہنچ جائیں گے اور ہم گھیرے میں آ جائیں گے۔ میں نے دیکھا کہ میرے آدمیوں کی غالب اکثریت خاموش تھی اور میرے حکموں کی منتظر تھی۔ اس لئے میرا دل بہت بڑھ گیا تھا۔ جب سے میں نے کمپنی کی کمان سنبھالی تھی اب جا کے مجھے حتمی ثبوت ملا تھا کہ میں اپنے آدمیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہم بات چیت کر ہی رہے تھے کہ باہر جانے والی پلاٹون کا ہرکارہ پہنچ گیا۔ دَنی چند بہت ہٹا کٹا موٹا تازہ آدمی تھا لیکن اس کی آواز عورتوں کی طرح باریک تھی۔ اس کی موٹی موٹی مونچھوں سے جب یہ آواز نکلا کرتی تھی تو سننے والوں میں تعجب اور ہنسی کے ملے جلے جذبات پیدا ہو جاتے تھے۔ آج تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ آتے ہی ایک مورچے میں گر گیا اور جب مطمئن ہو گیا کہ اپنے ہی آدمیوں میں محفوظ ہے تو عورتوں کی طرح بین شروع کر دیئے کہ "ہائے میری ماں۔ ہے پرماتما۔ اپنے منسوں پر کرپا کر: ہائے ساری پلاٹون برباد ہو گئی۔ جاپانی ظالموں کا بیڑا غرق ہو۔ ایک بھی تو نہیں چھوڑا"۔

"تم کیسے بچ کر نکل آئے؟" میں نے اس پر جرح شروع کر دی۔ بہت سے لوگوں کا اس کے اردگرد جمگھٹا لگ گیا۔ دنی چند میرے سوالوں کا جواب تو دے رہا تھا لیکن اس طرح کہ یہ بھی اس کی

آہ و بکا کا حصہ تھا۔

”میں بدقسمت بچ کہاں گیا ہوں مارا جاؤں گا۔ میں بھی مارا جاؤں گا صاحب بہادر ہم مارے گئے پرماتما دیا کرے رام رام رام رام.........“

”تم خود ہی بھاگ آئے ہو یا تمہیں جمعدار صاحب نے بھیجا ہے؟“

”جب جاپانیوں کا حملہ ہوا تو جمعدار صاحب نے کہا جاؤ صاحب بہادر کو اطلاع دے دو۔ ہائے ہم لُٹ گئے۔ ہم برباد ہو گئے سب مارے گئے سب مارے گئے“

”جب تم آئے ہو لیفٹیننٹ بانڈ زندہ تھے؟“

”جب میں ادھر آ رہا تھا تو میں نے انہیں زندہ سلامت دیکھا تھا لیکن وہ بھی مارے گئے ہوں گے کوئی نہیں بچا ہے۔“پرماتما“ صاحب بہادر ہم مارے گئے۔ برباد ہو گئے“۔

میں سوال پوچھتا جا رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے اندازے بھی لگا رہا تھا۔ اگر واقعی جمعدار نے دنی چند کو بھیجا تھا تو پہلی اچانک جھڑپ کے بعد ہی بھیجا ہوگا۔ اس کے بعد تو فائرنگ ہی نہیں ہوئی تھی۔ گویا اس وقت جمعدار اور لیفٹیننٹ بانڈ زندہ تھے۔ اگر دنی چند یونہی ڈر کر بھاگ آیا ہے تو بھی کچھ فائرنگ ہونے کے بعد ہی بھاگا ہوگا۔ ساری پلاٹون کے برباد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میری نظر نیچے میدان پر پڑی۔ وہاں ایک جلوس چلا آ رہا تھا۔ آگے آگے خچر تھے اور ان کے پیچھے ایک ایک دو دو کر کے پلاٹون کے سپاہی بھاگے چلے آ رہے تھے۔ دنی چند چونکہ مورچے میں محفوظ بیٹھا اپنی آہ و بکا میں محو تھا اس لئے اس نے یہ نظارہ نہیں دیکھا۔ البتہ باقی سب دیکھ رہے تھے۔ وہ اب بھی یہی کہہ رہا تھا ”سب مارے گئے سب برباد ہو گئے“ یکا یک میں نے کہنا شروع کر دیا ”صرف دنی مارا گیا وہی برباد ہو گیا اس لئے کہ وہ پاجی ہے وہ حرامزادہ ہے۔ وہ.........“ میں باتوں باتوں میں بغیر سوچے سمجھے نہایت مغلظ گالیوں پر اُتر آیا تھا۔ ایسی گالیاں جو میرے خواب و خیال میں تو گزری ہوں گی زبان پر کبھی نہ اُتری تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے باریک آواز میں دنی چند کی نقل اتارنی شروع کر دی تھی۔ لوگوں نے ہمارے مکالمے پر ہنسنا شروع کر دیا۔ یہ ہنسی دنی چند کو نہایت ناگوار گزر رہی تھی اور آہستہ آہستہ غصہ اس کے خوف کی جگہ لے رہا تھا۔

سب سے پہلے کمپنی پوزیشن میں خچر پہنچے۔ ان کے ساتھ ہی سپاہیوں کا تانتا لگ گیا۔ آہستہ آہستہ پلاٹون کی کُل تعداد سے نصف یعنی تقریباً بیس آدمی جمع ہو گئے۔ پلاٹون کمانڈر جمعدار بھی پہنچ گیا۔

ابھی تک لیفٹیننٹ بانڈ کا پتہ نہیں تھا۔ میں ہر کسی سے ان کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کے ساتھ کوئی خاص اُنس تھا۔ اس کے برعکس ہمارے تعلقات بہت روکھے پھیکے تھے۔ میں اس بات سے ڈر رہا تھا کہ اگر وہ مر گیا یا قید ہو گیا تو بدنامی ہو جائے گی۔ شک و شبہ کے ماحول میں شاید میرے سپاہیوں کی نیت پر بھی حملے کئے جائیں۔ کوئی بارہ بجے دوپہر کے وقت وہ بھی آوارد ہوا۔ اب میں نے اس سے اور جمعدار سے مفصل رودادشنی شروع کی۔ بہت سے بیان متضاد تھے۔ لیکن اس وقت اور بعد میں جو اطلاعیں ملیں ان سے اس واقعہ کا نقشہ کچھ اس قسم کا بنتا ہے۔ ہمارے لوگ افریقیوں کی بنائی ہوئی سڑک کے دونوں کناروں پر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر دو قطاروں میں چل رہے تھے کہ اچانک ایک موڑ پر ایک جاپانی پٹرول سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ جو تین تین کا پرا باندھ کر سڑک کے بیچوں بیچ مارچ کرتے آ رہے تھے۔ جاپانیوں نے چھوٹتے ہی ”بن زئی“ کا نعرہ مار کر ہلّہ بول دیا۔ ہمارے لوگوں نے ڈرل کے مطابق بغیر کسی حکم کے سڑک کے دونوں کناروں پر پوزیشن لے لی اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ ہو ہی رہی تھی کہ پیچھے کے لوگوں نے ایک ایک دو دو کر کے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ سب سے پہلے کون بھاگا۔ جمعدار کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے صرف خچر والوں کو واپس ہونے کو کہا تھا اور دنی چند کو کمپنی ہیڈ کوارٹر میں اطلاع دینے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے بعد لوگ رضاکارانہ طور پر بھاگنے لگے۔ لیفٹیننٹ بانڈ اور جمعدار نے بہتیری کوششیں کیں کہ لوگ رُک جائیں لیکن کامیاب نہ ہوئے چنانچہ ان کو بھی بھاگنا پڑا۔

کوئی ایک بجے دن تک تیس کے قریب آدمی پہنچ گئے۔ دس بارہ لاپتہ تھے۔ ان کے بارے میں مختلف رپورٹیں تھیں۔ کوئی کہتا تھا مارے گئے کوئی کہہ رہا تھا میدانِ جنگ میں زخمی پڑے ہیں جبکہ کسی کا خیال تھا کہ قیدی بنا لئے گئے ہیں۔ کسی کی رائے تھی جنگل میں تتر بتر ہو گئے۔ میں نے سرداروں کو جمع کیا اور دوبارہ رائے پوچھی۔ ایک نے کہا کہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ صرف بارہ آدمیوں کی قربانی پر جان بخشی ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیئے۔ یہ کام اب ہمارے بس سے باہر ہے۔ بٹالین کو اطلاع دینی چاہیئے تاکہ مناسب اقدام کریں۔ ایک بالکل نئی صورتحال میں پرانے احکام کالعدم سمجھے جائیں۔ دوسری رائے تھی کہ وہیں مورچہ جمایا جائے اور بٹالین کو اطلاع دی جائے پھر جیسا حکم طے کیا جائے۔ مجھے ایک اور فکر دامن گیر تھی وہ یہ کہ میرے آدمی بغیر حکم میدان چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ اگر کمپنی میں یہ ریت چل نکلی تو یہ فوج کا حصہ نہیں

رہے گی۔ ایک عام ہجوم کی طرح من مانیاں کیا کرے گی۔ بہت ممکن ہے کہ اس اچانک سانحہ کا ردِعمل جاپانیوں پر بھی وہی ہوا ہو جو میرے آدمیوں پر ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بھاگ بھی گئے ہوں۔ دِن دیکھے تو مجھے میدان نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے ارادہ کرلیا کہ جائے وقوعہ پر جا کر چھان بین کی جائے اور ممکن ہو تو گمشدہ آدمیوں اور زخمیوں وغیرہ کو واپس لایا جائے۔ چنانچہ میں نے بھگوڑا پلاٹون کو پوزیشن میں چھوڑا اور باقی کی دونوں پلاٹونوں کو ایڈوانس کی تیاری کا حکم دیا۔ کوئی دو بجے کے قریب جب تیاری مکمل ہوگئی تو میں نے سب آدمیوں کو اکٹھا کر کے آگے جانے کی ضرورت کو واضح کیا۔ جوانوں کے سامنے جس چیز پر زیادہ زور دیا وہ بلکتے ہوئے زخمیوں کی حالتِ زار اور ان ساتھیوں کی تلاش کی ضرورت جو جنگل میں بھٹک رہے تھے۔ اس نعرۂ تکبیر قسم کی اداکاری کا یہ اثر ہوا کہ ان لوگوں کی آوازیں دب گئیں جو زیادہ احتیاط کے حامی تھے۔ میرے اس خطرناک اقدام کی ذمہ داری تنہا مجھ پر نہ رہی بلکہ بہت سے لوگ اس جذبے کے حصے دار بن گئے۔ اس کی کامیابی کے لیے فکرمند، ہم پہاڑی کے اوپر سے جنگل کے بیچوں بیچ ایک قطار میں روانہ ہوئے۔ جنگل کی لڑائی کی ٹریننگ یہی تھی کہ ایک قطار میں چلا جاتا تھا۔ یہ خیال امریکہ کے ریڈ انڈین (Red Indians) کے طریق جنگ سے لیا گیا تھا۔ اس سے ایک تو جنگل میں سے گزرنے میں آسانی تھی۔ دوسرے اچانک حملہ ہوجانے کی صورت میں نقل و حرکت میں سہولت رہتی تھی۔ تھوڑی دور چل کر پہاڑی ایک طرف کو ہٹ گئی اور ہمیں نیچے اُتر کر وادی میں چلنا پڑا۔ وادی میں کوئی چار پانچ فٹ اونچی بہت گھنی گھاس اُگی تھی جس میں سے چلنا بہت دشوار تھا۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر گھاس میں حرکت شروع ہوئی۔ ہم رُک گئے اور سب کے ہتھیاروں کی نالیاں خود بخود اُدھر کو مُڑ گئیں۔ میں نے سختی سے حکم دیا کہ کوئی گولی نہ چلائے۔ حرکت ہماری طرف ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ کیا شے ہے۔ کوئی تیس قدم کے بعد ایک آدمی کا سر نمودار ہوا۔ وہ ہمارا اپنا آدمی تھا۔ اس کی بہت پھٹکار ہوئی۔ اس نے کہا کہ اُس نے ہمیں بہت دُور سے پہچان لیا تھا۔ لیکن جاپانیوں کی دہشت کی وجہ سے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھاس میں اس لئے رینگنا شروع کر دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہے۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ جو میرے آدمیوں نے گولی نہیں چلادی ورنہ اپنے لوگوں کے ہاتھوں اس کا قیمہ ہوجاتا۔ اس واقعہ سے اتنا فائدہ ہوا کہ ہمارا باہر نکلنا سہل ہوگیا اور ہم زیادہ اطمینان سے آگے بڑھنے لگے۔

میدانِ جنگ میں پہنچتے ہی میں نے دو حصّوں کو حکم دیا کہ اردگرد بلند زمین پر چڑھ جائیں اور ایک

حصّے کو نیچے میدان کی تلاشی پر لگا دیا۔ اس میں ہمیں بہت جلد کامیابی ہوئی۔ چھ آدمی ایسے مل گئے جنہوں نے لڑائی شروع ہوتے ہی باقاعدہ پوزیشن لے لی۔ ایک عرصہ کی ٹریننگ کے بعد ایسا کرنا اُن کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ ایسے ہی جیسے کسی کو مارنے کے لیے ڈنڈا اُٹھایا جائے تو وہ بلا سوچے سمجھے ہاتھوں اور بازوؤں سے سر اور آنکھیں ڈھانپ لیتا ہے۔ وہ گھاس میں دم سادھ کر پڑے تھے اور بالکل حرکت نہیں کر رہے تھے۔ میرے آدمی ان کے سروں پر جا کر کھڑے ہوگئے اور وہ بھی بے جان پڑے رہے۔ جب میں نے ایک نائیک کو بازو سے پکڑ کر اوپر کو کھینچا تو اس نے منت سماجت شروع کردی کہ اس کی جان بخشی جائے اس کا قصور نہیں۔ وہ تو محض پیٹ کے دھندے میں بھرتی ہوا تھا۔ اس نے فائر بھی تو بہت کم کیے ہیں۔ جو کیے وہ بھی ہوا میں۔ اس کی سٹین گن ملاحظہ کی جائے۔ اس کے بعد گڑگڑا کر پرماتما کے آگے پرارتھنا کرنے لگا کہ کسی طرح اس کی جان بچ جائے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جاپانیوں نے پکڑ لیا ہے۔ جب صوبیدار نے ڈھول دھپا کیا اور ڈوگری میں بے نقط سنائیں تو دیدے پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور ایسا چپ ہوا کہ جاپانیوں کی نقل و حرکت کے بارے میں ہمارے ضروری سوالوں کے جواب دینے سے بھی معذور رہا۔

ہم نے اپنا ایک آدمی مَرا ہوا پایا۔ یہ گورے رنگ کا جوان تھا جسے گلے میں گولی لگی تھی۔ جاپانی اس کی رائفل اور کاغذات لے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس کا رنگ اس کی موت کا باعث ہوا۔ جاپانیوں نے اسے انگریز افسر سمجھ کر مار دیا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جب لڑائی شروع ہوتی تھی تو کچھ اچھے نشانہ باز ایک طرف بٹھا دیتے تھے۔ ان کا کام تھا کہ افسروں اور دوسرے عہدہ داروں کو چُن چُن کر مار دیں۔ جو آدمی پستول، دوربین، نقشہ یا اس قسم کا دوسرا امتیازی نشان لئے ہوتا تھا اس پر شست باندھ لیتے تھے۔ چنانچہ اب قاعدہ ہوگیا تھا کہ افسر پستول کی بجائے ایک عام سپاہی کی طرح رائفل اُٹھاتے تھے۔ دوربین اور نقشے کو احتیاط سے استعمال کرتے تھے۔ انگریز تو چہروں پر رنگ بھی مل لیتے تھے۔

ہمیں کوئی دوسرا مردہ یا زخمی نہ ملا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے لوگوں کی طرح جاپانی بھی بے خبری کے عالم میں تھے کہ مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ بھی بدحواس ہو کر جلدی جلدی میدانِ جنگ کو چھوڑ گئے ورنہ ان کو پانچ اچھے خاصے قیدی مل جاتے۔ اب مُردے کو ٹھکانے لگانے کا سوال پیدا ہوا۔ سورج غروب ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی واپس کمپنی پوزیشن میں پہنچ جائیں۔ ڈوگرے مُردے کو بہت بُرا سمجھتے ہیں اور اس کے پاس

جانے اور ہاتھ لگانے سے بہت کتراتے ہیں۔ ان کی رائے تھی کہ بھگوان کا کرنا ہو گیا ہے اب اسے بھگوان کے حوالے ہی کر دیا جائے اور چلا جائے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ حکم دیا کہ کمبل میں باندھ کر گٹھڑی بنائی جائے اور بانس کاٹ کر ان میں لٹکا کر اُٹھا لیا جائے۔ کافی ردّوکد کے بعد سب اس تجویز پر راضی ہوئے۔ مُردہ آدمی بہت بوجھل ہوتا ہے۔ دو میل میں بہت سوں کو کندھا دینا پڑا۔ اس طرح بہت سے لوگ بھرشٹ تو ہوئے لیکن دن کی کارگزاری میں ان کو بلاواسطہ حصہ مل گیا۔ کمپنی پوزیشن میں لا کر ایک طرف قبر کھود کر مردہ سپاہی کو دفنا دیا گیا۔ جلانا ممکن نہیں تھا۔ کریا کرم کے لیے اس کی چوٹی جلانے پر ہی اکتفا کیا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ مجبوری میں اتنا ہی کافی ہے۔

سب لوگ خوش تھے۔ صبح کی شکست شام ہونے تک فتح میں بدل گئی تھی۔ جو لوگ تخیل ہی تخیل میں اپنے لوگوں کے کشتوں کے پشتے لگا رہے تھے وہ جھٹلائے گئے۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ جاپانی بھی ہماری طرح گوشت پوست کے انسان تھے اور ہمارے جیسی بدحواسیوں کا شکار۔ یہ بھی ہوا کہ سپاہیوں اور سرداروں کا مجھ پر اعتماد ہو گیا۔ سپاہی خاص طور پر اس بات سے بہت مطمئن تھے کہ میں نے ایک مُردہ سپاہی کو واپس لانے میں اتنا تردّد کیا تھا۔ ان کو یقین ہو گیا کہ میرے دل میں ان کی قدر تھی اور میں ہر حالت میں ان کا ساتھ دوں گا۔

شام کا جھٹپٹا ہونے پر میں نے لیفٹیننٹ بائڈ کو ایک حفاظتی دستے کے ہمراہ واپس بھیج دیا تاکہ کرنل کو نئی صورتحال سے آگاہ کریں اور مزید احکام لے آئیں۔ دن بھر کی کارروائی کے مختصر حالات لکھ کر وہ بھی ساتھ کر دیے۔ ایک مردے کے علاوہ دو آدمی گم تھے یہ دونوں ہندو جاٹ تھے اور خچر پاتری تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی بھاگ آئے تھے۔ لیکن تیزی میں دریا عبور کر کے پیچھے کی طرف نکل گئے تھے۔

چاندنی رات تھی کوئی دس بجے ہوں گے کہ مارچ کرتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ تیس چالیس جاپانی سڑک کی اوپر چلے آ رہے تھے۔ "مزادہ" کے گاؤں کے پاس پہنچے تو "جی دار" "ہوشیار" پکارنے لگے۔ شاید انڈین نیشنل آرمی (آئی این اے) کے آدمی بھی اُن کے ساتھ تھے۔ آتے ہی چاروں طرف اندھادھند فائرنگ کرنے کے ساتھ ساتھ، پٹاخے اور آتشبازیاں چھوڑنے لگے۔ کچھ دریا کے اس پار ہو گئے اور اسی طرح کا شوروغوغا مچانے لگے۔ اس حرکت کے ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ سمجھتے تھے، اگر ہم اس علاقے میں ہوں گے تو یا مقابلے میں گولیاں

چلانی شروع کر دیں گے اور اس طرح اپنی پوزیشن ظاہر کر دیں گے یا علاقہ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ لیکن ہم چُپ سادھے پڑے رہے۔ میں نے خچروں کے آگے کھلا دانہ رکھوا دیا تاکہ کھانے کے شغل میں لگے رہیں اور آواز نہ نکالیں۔ کچھ دیر بعد جاپانیوں نے فائرنگ بند کر دی اور گاؤں میں مرغیوں کو پکڑنا شروع کر دیا جو شور مچا رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ گاؤں والے ساری مرغیاں ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ آدھی رات کے بعد سکون ہوا۔

7 مارچ کا دن چڑھا تو جاپانی گاؤں میں ادھر اُدھر مٹرگشت کرنے لگے۔ کچھ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں افریقی ذخیرے سے پیراشوٹوں کا کپڑا اور ربڑ کے جوتے پسند کرنے لگے۔ میں نے آہستہ آہستہ سب ہتھیاروں کا منہ ان کی طرف کر دیا اور موقع غنیمت دیکھ کر یکدم فائرنگ شروع کر دی۔ کئی وہیں ڈھیر ہو گئے لیکن دوسروں نے جھٹ ان کی لاشیں کندھوں پر ڈالیں اور اس طرح ان سے بیگار کا کام لے کر بھاگنے لگے۔ ہم سب جوش میں ادھر اُدھر ناچ کود رہے تھے۔ جاپانی مشین گن والوں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن مناسب آڑ نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ میں اگر تین انچ دہانے کے مارٹروں کا استعمال کرتا تو مکانوں کی آڑ میں پناہ لینے والوں کا بھی صفایا ہو جاتا۔ لیکن میں نے ان کا ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ ان کو اس طرح راز میں رکھنے سے بعد میں بہت فائدہ ہوا۔

کچھ دیر کے بعد جب دیکھا کہ جاپانی غائب ہو گئے ہیں تو نیچے آ گئے۔ مال غنیمت میں بہت سی رائفلیں ملیں اور بہت سی مرغیاں بھی جن کی جاپانیوں نے ٹانگیں باندھ رکھی تھیں۔ دو جاپانی مُردہ پائے گئے اور برما نیشنل آرمی کے دو برمی قیدی بھی ملے۔ جاپانی مُردوں کے سب کپڑے اُتار لیے گئے تاکہ ان کو پیچھے بھیجا جا سکے۔ ان کی جیبوں سے بہت سے کاغذات اور بچوں کی تصویریں ملیں۔ کچھ ان کے خاندان کے گروپ فوٹو تھے۔ ان یتیموں اور بیواؤں کا خیال کر کے کافی دیر مجھ پر رقت طاری رہی۔ انسان انسان کے درپے کیوں تھا؟ میرا یہ جنگ کا پہلا دن تھا۔ اسی دن بٹالین کی طرف سے چار آدمیوں کا ایک پٹرول کئی دن جنگلوں میں بھٹکنے کے بعد ہمارے پاس پہنچا۔ میں نے جاپانیوں کی وردیاں اور کاغذات ان کے حوالے کیے۔ ایک مفصل رپورٹ بھی لکھ کر دی اور واپس چلتا کیا۔

آٹھ مارچ کی صبح امن سے گزری۔ جاپانیوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہم سمجھنے لگے کہ بھاگ گئے ہیں۔ کوئی دو بجے کے قریب "بی" کمپنی کے چار جوانوں کی "می چانگ" (ندی) کے شمالی کنارے

پر نظر پڑی۔ بلی کو چھچھڑوں کا خواب، سمجھے کمک آئی ہے۔ وہ فیری کا ادھر والا یعنی جنوبی سرا محفوظ کرنے کے لئے پلاٹون لے کر نیچے اترے۔ بہت تکلیف کے ساتھ مورچہ لگایا تاکہ جب بٹالین دریا عبور کر رہی ہو تو حملہ نہ ہو جائے۔ ان چار کو آوازیں دیں کہ کتنے آدمی ہو لیکن ان کی ہریانوی پنجابی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ فیری جب ان کی سواری کے لئے دریا کے اس طرف بھیجی تو چار کے علاوہ پانچواں آدمی نہ تھا۔ ہم بہت سٹپٹائے اور غصہ ان چاروں کو کوس کر نکالا۔ اتنے میں میں نے ایک آدمی کو "می چانگ" کے شمالی کنارے کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف جاتے دیکھا۔ خیال کیا کہ کوئی مقامی آدمی ہے۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ دشمن کا جاسوس تھا۔

ان چار کو پار کرانے کے بعد میں نے واپسی کا حکم دیا لیکن سب طرف سے اصرار ہونے لگا "مزادہ" گاؤں کی تلاشی ہونا چاہیے۔ میں اپنے لوگوں کا جوش اور ولولہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اگرچہ مجھے اس میں فوجی فائدہ نہیں نظر آ رہا تھا لیکن اس خیال سے کہ ان کی خوشی بھی ہو جائے، اجازت دے دی۔ اب وہ سب ایک دم گاؤں پر دھاوا بولنا چاہتے تھے لیکن میری محتاط طبیعت نے گوارا نہ کیا اور حکم دیا کہ باقاعدہ منزل بہ منزل آگے بڑھا جائے۔ بہت بعد میں پتہ چلا کہ گاؤں کی تلاشی کا مقصد جاپانیوں کی تلاش نہیں بلکہ چاول کی شراب تھی جو اس علاقے کے دیہات میں بہتات میں بنائی جاتی تھی۔ معلوم ہوا میرے لوگوں کی گشت پر جانے کے لیے بے تابی کا بھی یہی راز تھا۔ وہ اس پر اصرار کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو "تُو تُو میں میں" ہو جاتی تھی کہ کس کو سبقت ملے۔ حالانکہ دشمن کے علاقہ میں گشت کرنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ میں نے شراب نہیں پی اس لئے وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس "خطرناک شراب" کا رنگ اس شراب سے ضرور تیز ہوگا جو صرف محتسبوں، ناصحوں اور صالحوں سے چھپ کر پی جاتی ہے۔

میرے جوانوں کی رندی بہت جلد کافور ہو گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ جاپانی سات تاریخ کو مار کھا کر کہیں دور جا بیٹھے ہوں گے اور مرہم پٹی کر رہے ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں تھا وہ نزدیک ہی تاک میں بیٹھے تھے اور ہماری خوش قسمتی سے ان کا ایک آدمی پانی لینے کے لئے دریا پر اتر آیا۔ ہمارے ایک آدمی نے اس کا نشانہ بنا لیا۔ وہ زخم کھا کر نہایت خوفناک اور دردناک طریقے سے بلبلایا۔ اس طرح کہ اس کی چیخ ہوا میں گونج اٹھی۔ گھبراہٹ میں جاپانیوں نے قبل از وقت فائرنگ شروع کر دی۔ ورنہ اگر گاؤں کی تلاشی کے دوران میں ایسا کرتے تو ہمارا وہی حشر ہوتا جو ایک دن پہلے ان کا ہوا تھا۔ جاپانی مشین گن کی گولیوں کا پہلا پراگا میرے پاس ہی پڑے ہوئے ایک جوان پر پڑا۔

اس کا بھیجہ باہر نکل آیا اور وہ ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے فوراً پسپائی کا حکم دیا۔ اب دونوں طرف سے بہت زور کی فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم گاؤں کے آموں کے بڑے بڑے پیڑوں اور ٹوٹی پھوٹی زمین کی آڑ لیتے ہوئے حفاظت سے نکل آئے۔ مردہ سپاہی کو واپس لانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن ناکام رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جاپانیوں نے ایک مشین گن کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ ہم اپنا مردہ حاصل نہ کر سکیں۔ اس کی رائفل کھینچنے کی کوشش کی گئی مگر اس میں بھی ناکام رہے۔ مجھے ایسا سجھائی دے رہا تھا کہ جاپانی نشانہ بازوں نے میری ذاتی پوزیشن کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ کیونکہ میرے آدمیوں کی نقل و حرکت کا مرکز وہی جگہ تھی۔ وہاں ہم دو آدمی تھے۔ میں ایک عام سپاہی کے لباس میں تھا لیکن میرے ساتھ والا سپاہی شوقین مزاج تھا۔ وہ ایک ہفتہ پہلے موٹر ڈرائیور کی ڈیوٹی سے بدل کر آیا تھا اور کندھے پر ایک ڈوری پہن رکھی تھی جس کے ساتھ پستول یا سیٹی باندھی جاتی ہے۔ جاپانیوں نے دوربین سے یہ دیکھ لیا ہوگا اور اس کو افسری کی نشانی سمجھ کر اس کی تاک میں رہے۔ اس طرح وہ بیچارہ موت کا شکار ہو گیا۔

ہم واپس پہاڑی پر چڑھے ہی تھے کہ جاپانی مارٹروں کے گولے برسنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا ان کے پاس ایک ہی مارٹر تھا اور اس کے لئے بھی گولوں کی تعداد کافی نہیں تھی۔ اس لئے کہ گولے بہت دھیمی رفتار سے چھوڑے جا رہے تھے۔ ایک گولہ پھٹتا تھا تو دوسرا چھوڑا جاتا تھا۔ گولہ پھٹنے کی آواز اور گولہ چلنے اور اس کے پھٹنے کے درمیانی وقفے سے ہم نے یہ اندازہ لگا لیا کہ مارٹر چھوٹی قسم کا ہے۔ ایک جاپانی درخت پر چڑھ کر زور زور سے مارٹروں کو ہدائتیں دے رہا تھا۔ اس وقت تک گولیاں چلنی بند ہو گئی تھیں اور جنگل پر شام کا سناٹا چھا گیا تھا۔ اس سناٹے میں جاپانی کی آواز گولوں کے دھماکے سے بھی زیادہ بھیانک سنائی دے رہی تھی۔

اس گولہ باری سے جاپانیوں کے دو مقاصد ہو سکتے تھے۔ یا تو وہ گاؤں میں داخل ہو کر ہمارے نقصان کا اندازہ کرنا چاہتے تھے اور اگر کوئی زخمی مل جائے تو پوچھ گچھ کے لیے اسے قید کرنا چاہتے تھے یا سیدھا حملہ کر رہے تھے۔ دوسرے امکان کی توقع میں مَیں نے باہر بھیجے ہوئے دستے واپس بلا لئے۔ تین انچ کے مارٹروں کو تیاری کا حکم دیا اور سب کو الرٹ (Alert) کر دیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کی گولہ باری کے بعد جاپانی مارٹر چلنا بند ہو گیا اور دریا کی طرف والے سرے کی جانب بے پناہ گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ گولیاں ہمارے لوگ چلا رہے تھے کیونکہ میری طرف گولی نہیں آ رہی تھی۔ میں سمجھا انہوں نے گھبراہٹ میں ایسا کیا ہے۔ میں اپنے مورچے میں کھڑا ہو گیا اور شور

مچانے لگا فائر بند کردو۔ فائر بند کردو"۔ اِدھر سے جواب آیا کہ جاپانی پوزیشن میں گھس آئے ہیں۔ جب فائرنگ دیر تک بند نہ ہوئی تو میں نے مارٹروں کو گولہ باری کا حکم دیا۔ انہوں نے اس راستہ پر گولے پھینکنے شروع کردیئے جو جاپانی پوزیشن سے ہماری پوزیشن کے دریا والے سرے کی طرف آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لڑائی بند ہوگئی۔ چاروں طرف جاپانی زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ باقی رات کا سناٹا تھا۔ رات ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔

9 مارچ کی صبح ہوئی تو سب تھکے ماندے تھے۔ دریا کے نزدیک والے لوگوں نے بتایا کہ رات بھر جاپانی اپنے مردے گھسیٹتے رہے اور زخمیوں کو اُٹھاتے رہے۔ دیکھ بھال کرنے والی پٹرولنگ نے بتایا کہ مارٹروں کی فائرنگ نے جاپانیوں کا اتنا نقصان کیا تھا کہ دریا کے ساتھ والی پگڈنڈی انسانی گوشت و پوست اور خون سے لت پت تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق "انسانی خون سے پھسلاہٹ ہوگئی ہے اور بوٹیاں جھاڑیوں سے لٹکی ہوئی ہیں"۔ اس میں مبالغہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جونہی ہم نے "مزادا" گاؤں سے پسپائی شروع کی جاپانیوں نے بڑھنا شروع کردیا۔ ہمارے سر نیچے رکھنے کے لیے مارٹر چلانے لگے۔ دریا کے ساتھ ساتھ بڑھنے کے بعد ہماری پوزیشن کے نیچے پہنچ کر وہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ دریا کے اوپر لٹکی ہوئی چٹان سے گزر کر ہمارے مشرق کی طرف آنکلا (یہ کام جاپانی ہی کرسکتے تھے۔ وہ لوگ ربڑ کے جوتے پہنتے تھے اور ایسے معاملات میں بہت تربیت یافتہ تھے) دوسرے حصے نے مغرب کی طرف سے حملہ کردیا۔ ان کا اندازہ ہوگا کہ ہماری پوزیشن عین دریا کے کنارے تک ہے اور اس طرح اپنے خیال میں ہماری پوزیشن کے بیچوں بیچ حملہ کرکے اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی بدقسمتی تھی کہ میں نے عام ڈگر کے خلاف دریا سے ہٹ کر پوزیشن لگائی تھی۔ (دریا اور اس کے پار کے علاقے کی نگرانی کے لیے دن کے اوقات میں ایک عارضی دستہ متعین کردیا تھا۔ ان کو خندقیں کھودنے سے منع کردیا تھا تاکہ رات کی تاریکی میں جاپانی آکر ان پر قبضہ نہ کرلیں۔ یہی وجہ تھی کہ جاپانی ہماری پوزیشن کی بیچوں بیچ آنے کی بجائے ہماری مشین گنوں، ٹامی گنوں اور رائفلوں کے دہانوں کے سامنے آنکلے اور بھون دیئے گئے۔ ان کے مُردوں میں ایک میڈیکل اردلی تھا جس کے میڈیکل بکس سے بہت سی دوائیاں اور مارفین کے ٹیکے مل گئے۔ دراصل ان کے حملے کی کمر تین انچ مارٹروں نے توڑ دی تھی۔

7 مارچ کی صبح کو جی کڑا کے میں نے ان کے استعمال سے ہاتھ روک لیا تھا اب اس صبر کا پھل ملا۔

مارٹروں نے بعد کی اطلاع کے مطابق جاپانیوں کو شدید جانی نقصان بھی پہنچایا۔ لیکن اس سے بڑا نقصان وہ صدمہ تھا جو ان کی غیر متوقع گرج نے ان کے دلوں میں پیدا کردیا اور جس سے ان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ لڑائی میں سب سے کارگر حربہ وہ ہوتا ہے جس کی توقع نہ ہو۔

سنتریوں نے بتایا کہ رات انہوں نے ہماری پوزیشن کے جانب جنوب کی جانب کوئی ایک میل کے فاصلے پر ٹرک کی روشنی دیکھی تھی۔ کئی ایک نے موٹر کے انجن کی گونج بھی سُنی تھی مگر مجھے ان کی بات کا یقین نہ آیا۔ ایک دو سرداروں اور دوسرے عہدہ داروں نے بھی ان رپورٹوں کی توثیق کی۔ بعض نے تو اتنا بھی کہا کہ دو تین دن سے ٹرکوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن ان کو بھی یقین نہیں آرہا تھا اس لئے ذکر نہ کیا۔ اس خبر کے نتیجے بہت بھیانک تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ افریقیوں کی دریائے "کلاوان" کے مشرقی کنارے کے ساتھ بنائی ہوئی سڑک پر اب جاپانیوں کا قبضہ ہے اور وہ "اکیاب" سے موٹروں کے ذریعے میری پوزیشن تک آجاسکتے ہیں یعنی صرف میری ایک کمپنی جاپانیوں کے راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔ اس سے کم خطرناک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ جاپانیوں نے افریقیوں کے کچھ ٹرک پکڑ لئے تھے اور ان کو سڑک کے کچھ حصہ پر آمدورفت کیلئے استعمال کررہے تھے۔ بہرحال یہ خبر کافی پریشانی کا باعث ہوئی اس لیے کہ اب تک ہم اس حوصلے میں بیٹھے تھے کہ جو جاپانی ہم تک پہنچیں گے وہ افریقی ڈویژن کے گرد چکر کاٹ کر پہاڑوں میں سے ہوکر آئیں گے۔ اس طرح جنگ کا بھاری سامان مثلاً توپیں، بھاری مارٹر اور ان کا گولہ بارود نہیں لاسکیں گے اور ان کی تعداد بھی ہمارے نکتہ نگاہ سے مناسب ہی ہوگی۔ لیکن اب صورت بالکل بدل گئی تھی۔ سراسیمگی مٹانے کے لیے اور کم از کم اپنی لاپرواہی یا ہٹ دھرمی ظاہر کرنے کے لئے میں نے سختی کے ساتھ یہ خبر ماننے سے انکار کردیا۔ اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ جاپانیوں کے پاس ٹرک ہونے کے باوجود میرا ارادہ اس پوزیشن سے ہلنے کا نہیں تھا۔

اسی صبح سوال پیدا ہوا کہ آیا جاپانیوں کا پیچھا کیا جائے یا نہیں۔ میرے پاس اگر ایک کمپنی اور ہوتی تو یہ سوال پیدا نہ ہوتا۔ پٹے ہوئے دشمن کا تعاقب لازمی تھا۔ لیکن میری کمپنی کا کافی زور لگ چکا تھا۔ جاپانیوں کے مزاج کا پارہ بھی روز بروز چڑھتا جارہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ طیش کھا کر مزید حملے کریں گے۔ علاقے پر قبضہ کرنا نہ ان کا مقصد تھا نہ میرا۔ پہاڑ کے پہاڑ خالی پڑے تھے۔ البتہ "می چانگ" کی فیری (Ferry) پر قبضہ رکھنے کے لیے اس جگہ کا قبضہ ضروری تھا جہاں میں بیٹھا تھا۔ اس وقت ہماری لڑائی کا دوسرا مقصد ایک دوسرے کی سپاہ کو برباد کرنا تھا۔ جاپانیوں کی عادت تھی کہ دم

روک کر کھڑے رہتے تھے اور جب دشمن بے خبری کے عالم میں میدان میں آڑ کے بغیر ہوتا تھا تو حملہ کر کے نقصان پہنچاتے تھے۔ میرے ساتھ بھی ایک دن پہلے یہ ہو چکا تھا اور اس سے ایک دن پہلے میں ان کے ساتھ یہی کچھ کر چکا تھا۔ پیچھا کرنے کی ضرورت اس لئے بھی پیش نہ آئی کہ میری پوزیشن کو مکمل گھیرا نہیں پڑا تھا۔ شمالی کنارہ دریا کے ساتھ ملتا تھا اور ابھی تک جاپانیوں کو مشرق کی طرف پڑاؤ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ جنوب کی طرف اگرچہ علاقہ انہی کا تھا لیکن میری پوزیشن کے قریب کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کی گئی تھی۔ مغرب میں البتہ "مزادا" گاؤں کا میدان اور اس سے اُدھر کی پہاڑیاں اور جنوب کی طرف جاتی ہوئی سڑک ان کے پاس تھی۔

دس بجے کے قریب دو "کومی" (برما کے پہاڑی باشندوں کا ایک قبیلہ) اِدھر آ نکلے۔ ان کے پاس ہماری ایک رائفل بھی تھی جو ہم ایک دن پہلے کی جھڑپ میں چھوڑ آئے تھے۔ اس سے ان کا مقصود دوستی کا اظہار تھا۔ دو دن پہلے وی۔ فورس ("V" Force) کا ایک انگریز کپتان چند مقامی ایجنٹوں کے ساتھ آ گیا تھا۔ ("وی" فورس فوجی جاسوسی کا حصہ تھی جو جاپانی اور انگریزی افواج کے درمیانی علاقے میں کام کر رہی تھی) یہ لوگ افریقی ڈویژن کے ہیڈکوارٹر پہنچنے کے ارادہ سے سفر کر رہے تھے۔ ان کی مدد سے "کومیوں" کی کہانی سُنی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ انگریزوں کے حامی تھے اور انہوں نے افریقی ڈویژن کی بہت مدد کی تھی۔ اب جاپانی واپس آ گئے تھے اور انہوں نے ان کے "سروں" کا انعام مقرر کر دیا تھا۔ اب وہ پناہ لینے کیلئے ہمارے پاس پہنچے تھے۔ میں نے ان سے جاپانیوں کا حال پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ بہت نقصان اُٹھا چکے ہیں اور علاقہ چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ جاپانی ابھی گھات میں بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے کا حکم دیا تاکہ بالفرض اگر جاپانی جاسوس ہوئے تو بھاگ کر ہمارے حالات کی اطلاع اُن کو نہ دے دیں۔ اتنا ضرور تھا کہ جس طرح میدان کے رہنے والے برمی اس وقت تک بحیثیت مجموعی جاپانیوں کے ساتھ تھے، اس کے برعکس برما کے پہاڑی قبیلے انگریزوں کے طرفدار تھے۔ اس طرح مقامی دھڑا بندی بین الاقوامی دھڑا بندی کا حصہ بن گئی تھی۔ بعد میں جب ہم نے راہِ فرار اختیار کی تو یہ دونوں "کومی" خضرِ راہ ثابت ہوئے۔ شام کے وقت انہوں نے اشاروں سے میرے پاس فریاد کی کہ ان کے ہاتھ زیادہ کس کے باندھ دیئے گئے ہیں تو میں نے نرم کروا دیئے۔

سہ پہر کو بہت سے لوگ نیچے میدان میں نظر آئے۔ انہوں نے برمیوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ افریقی ڈمپ (Dump) لوٹ رہے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ جاپانی بھیس بدل کر

ہماری پوزیشن کا اندازہ کر رہے تھے۔ مقامی باشندوں نے میل ہا میل تک رات کی لڑائی سنی ہوگی۔ مارٹر کے گولے پھٹنے کی آواز پہاڑی علاقے میں اور خاص کر رات کے وقت بہت دور تک گونج اُٹھتی ہے۔ یہ لوگ تو اپنے بال بچوں اور مال ومنال کو لے کر پہاڑوں کی کھوؤں میں پناہ لے رہے ہوں گے۔ مقامی آبادی میں فوجی کپڑے لوٹنے کی ہمت کہاں ہوگی۔ حکم دیا مارٹر سے ان کی تواضع کی جائے۔ تین گولے ان کے بیچوں بیچ پڑے اور وہ تتر بتر ہو گئے۔ میرا مقصد اس سے جاپانیوں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم ڈٹے ہوئے ہیں اور ہمارے پاس گولہ بارود اتنا وافر ہے کہ تماشے کے لیے بھی کچھ گولے چھوڑ سکتے ہیں اور اپنے لوگوں کے حوصلے بڑھانے بھی منظور تھے۔ مزید برآں اگر جاپانی تھے تو جتنے بھی مارے جائیں بہتر تھا اور اگر برمی تھے تو ان کو وہاں نہیں ہونا چاہئیے تھا تاکہ جاپانی انہیں بار برداری کے طور پر استعمال نہ کرسکیں۔ لڑائی میں درجن دو درجن معصوم یا مجرم جانوں کا ضیاع معمولی بات تھی۔

اس دن میں نے اپنے ہاتھوں سے جنگ کی پہلی اور آخری گولی چلائی۔ ایک سپاہی ایک بھاگتے ہوئے برمی (یا جاپانی) پر شست باندھ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بندوق لے کر گولی چلا دی۔ وہ آدمی ایک دم اُچھل پڑا لیکن گرا نہیں بلکہ ساتھ ہی نشیب میں چھپ گیا۔ فاصلہ کافی تھا اس لئے سپاہی کی نظروں میں سبکی تو ہوئی لیکن زیادہ نہیں۔ اطمینان قلب البتہ بہت ہوا کہ انسانی خون سے ہاتھ نہیں رنگے گئے۔ اس کے بعد بہت دفعہ موقع ملا لیکن میں نے اپنے ہاتھ سے گولی چلانے سے ہمیشہ گریز کیا۔

اس دن ہمارا راشن ختم ہو گیا۔ سرداروں نے آ کر مجھے خبر دی۔ ان کے اندازِ گفتگو سے مترشح ہوتا تھا کہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ آپ بھی واپس ہٹو گے یا نہیں۔ میرے دل میں خواہ مخواہ غصہ پیدا ہو گیا لیکن حالات کی نزاکت کا بھی احساس تھا۔ بٹالین کی طرف سے مدد تو ایک طرف، کوئی اطلاع بھی نہیں آ رہی تھی۔ وائرلیس کا پہلے دن سے ہی سلسلہ قائم نہیں ہو سکا تھا۔ ایمونیشن ختم ہو رہا تھا۔ اگر میں سختی سے کنٹرول نہ کرتا تو کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ روزانہ جھڑپوں میں سپاہیوں کا ذہنی، جسمانی، اعصابی زور لگ رہا تھا۔ کچھ لوگوں کے عزیز اور کچھ کے دوست لڑائی میں کام آ چکے تھے۔ باقیوں کا بھی زندگی پر بھروسہ ختم ہو رہا تھا۔ میں نے غصے پر قابو پا کر بہت دھیمے انداز میں صورتحال کے بارے میں اپنا نکتۂ نظر پیش کیا۔ "پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں اُداس ہونے کی جلدی نہیں ہونی چاہئیے۔ ہم گھر سے چالیس دن کیلئے نکلے ہوئے ہیں ابھی صرف ایک ہفتہ ہوا ہے ان چالیس دنوں

میں جاپانیوں سے مڈھ بھیڑ لازمی تھی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ مڈھ بھیڑ ایسی جگہ ہوئی ہے جو ہمارے پسند کی ہے اور جاپانیوں کیلئے ناموزوں۔ ممکن ہے بٹالین آگے آ رہی ہو اس وقت موجودہ پوزیشن کی قدر واضح ہو جائے گی۔ اگر اب چھوڑ گئے اور بعد میں جاپانیوں سے لڑ کر لینی پڑی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ آخر اتنے سالوں سے فوج میں کس لئے ہیں؟ یہاں نہیں لڑیں گے تو کہیں اور لڑنا پڑے گا۔ کرنل نے راشن دریا کے راستے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ دریا پر جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ ممکن ہے دوسرے ذرائع سے راشن آ رہا ہو۔ میری رائے تو یہ ہے کہ یہاں ڈٹ جانا چاہیے اور اس کیلئے خچروں کا گوشت کھانا پڑے گا تو کھانا ہوگا۔ آپ کو مذہبی مناہی تو نہیں ہے؟" اس جوابی حملے سے سردار بھنا گئے اور خچروں کے گوشت کے بارے میں معذرت کرنے لگے۔ کہنے لگے دو دن بھوکے لڑیں گے اس کے بعد بھی راشن نہ آیا تو خچر کھا لیں گے۔ چار خچروں میں سے ایک مر چکا تھا دو زخمی تھے اور صرف ایک ابھی تک قائم تھا۔

ہماری گفتگو سپاہی اور دوسرے عہدہ دار بھی سن رہے تھے۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ جو صاحب بہادر کہیں گے ہم وہی کریں گے۔ میرے اب تک کے فیصلے اتنے صحیح اور کامیاب ثابت ہوئے تھے کہ ڈوگروں میں مشہور ہو گیا تھا کہ مجھ پر پنج پیر کی تھاپنا ہے۔ وی (V) فورس کے انگریز کپتان کا خیال تھا کہ میں سٹاف کالج کا گریجوایٹ ہوں۔

میرے خیال میں میرے فیصلوں کی درستی کی چار وجوہات تھیں۔

1- میں نے جاپانیوں اور ان کے طریق کار کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ چونکہ جاپانی اپنے طریق کار کو بدلنے کے حامی نہیں تھے اس لئے میں ان کے ایک قدم کے بعد آنے والے اقدام کی سمت اور نوعیت پہلے ہی سے بھانپ لیتا تھا۔

2- میری عادت تھی کہ لوگوں کی رائے کے لیے کان کھلے رکھتا تھا۔ صحیح رائے اس وقت عموماً نہیں ملتی جب کسی سے سرکاری طور پر دریافت کیا جائے۔ تب تو آدمی الفاظ کی ترکیب اور انتخاب میں الجھ جاتا ہے اور وقار اور شہرت (Reputation) کا ملبہ سچ کو دبا لیتا ہے۔ میں اپنے لوگوں کی رائے اس وقت جمع کرتا تھا جب وہ کھانا کھا رہے ہوتے تھے یا ہنسی مذاق میں مشغول یا غصے میں کوئی بات کہہ جاتے تھے۔ ایک دفعہ بات کا سراغ جاتا تھا تو باقاعدہ تحقیق شروع کر دیتا تھا تاکہ یا تو ڈھول کا پول کھل جائے یا کچھ ہاتھ آ جائے۔

3- مجھے سوتے جاگتے ایک ہی لو لگی رہتی تھی کہ یہ معلوم کر سکوں کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ اس

طرح سے مختلف ذہنی خاکے بناتا رہتا تھا اور موقع پڑنے پر اکثر یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس راہ سے پہلے گزر چکا ہوں۔

4- قسمت کی خوش نصیبی کہیے جو سب سے عمدہ وجہ تھی۔ بہر صورت کامیابی سے بڑی کاریگری کیا ہو سکتی ہے۔ یہی فیصلہ ہوا کہ ڈٹا جائے۔

رات ہوئی تو میں نے وائرلیس کے ذریعے بی بی سی کی خبریں سنیں۔ ان میں پانچ دن کے بعد انکشاف کیا گیا تھا کہ افریقی ڈویژن "کلاوان" دریا کا مشرقی کنارہ چھوڑ کر نہایت کامیابی کے ساتھ مغربی کنارے پر ہو گئی ہے اور جاپانیوں کے تابڑ توڑ حملوں کا بہت بہادری اور ثابت قدمی سے جواب دے رہی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اتنے دن خبر کو سکیورٹی کے لیے روک رکھا گیا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سڑک واقعی جاپانیوں کے قبضے میں تھی اور ان کے ٹرکوں کے آنے جانے کے بارے میں تمام رپورٹیں صحیح تھیں اور وہ جتنی چاہتے، کمک لا سکتے تھے۔ اس رات جاپانی ٹرکوں کی آمد و رفت بہت تیز رہی۔ یہ رات بھی ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔

10 مارچ صبح سے ہماری پوزیشن سے کوئی ایک میل جانب جنوب بہت شور و غل تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اپنی شہرت کے برعکس جاپانی دھوم دھڑکے سے دن کے وقت حملہ کرنے والے تھے۔ میں نے نقشے سے ماپ کر اس جگہ پر مارٹروں کا نشانہ لگا دیا جہاں ہمارا اندازہ تھا کہ جاپانی گولہ بارود کا ذخیرہ کر رہے ہیں۔ جانب جنوب کوئی آٹھ سو گز پر ایک پٹرول بھیج دیا اور ان کو حکم دیا کہ جونہی ادھر سے جاپانیوں کی نقل و حرکت دیکھیں واپس آ جائیں۔

اسی طرح کا ایک پٹرول چار سو گز پر بھیج دیا تاکہ اگر پہلے پٹرول کو دھوکہ ہو جائے تو دوسرا دیکھ سکے۔

ایک سپاہی رضاکارانہ طور پر نزدیک کے ایک درخت کی چوٹی پر چڑھ گیا اور وہاں سے آنکھوں دیکھا حال (Running Commentary) دینے لگا۔ اب یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ جاپانی جنوب کی طرف سے پہاڑی کے اوپر اوپر سے بڑھنے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ حملہ کرتے وقت وہ برابر کی سطح سے بڑھ سکیں اور ان کو عین حملے کے وقت چڑھائی نہ چڑھنا پڑے۔ ادھر سے آنے سے اگر ان کا پہلا ہلہ کامیاب نہ بھی ہو تو وہ مجھ سے کچھ ہٹ کر پہاڑی کی چوٹی پر خندقیں بنا سکتے تھے۔

اس طرح مجھے اپنی پوزیشن اور دریا کے درمیان سینڈوچ کر سکتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو میری پوزیشن کی کلید مل گئی ہے۔ اب زندگی اور موت کا سوال ہے۔

سرداروں کو جمع کیا ان کی رائے دریافت کی۔ ہم سب کی رائے ایک تھی۔ جاپانیوں نے سوچ سمجھ کر

حملے کے لئے صبح کا وقت تجویز کیا تھا۔ ان کے پاس سارا دن تھا جس میں وہ دوٹوک فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر میں یہ قرار پایا کہ جاپانیوں کو آنے دیا جائے۔ ہم مورچوں میں ہوں گے وہ کھلی زمین پر۔ اس لئے ایسی جھڑپ میں ہم فائدے میں رہیں گے۔ لیکن میں نے ایک عام اعلان کر دیا کہ اگر حملے کے دوران کوئی آدمی بھی جاپانی بیلچوں کی آواز سنے تو فوراً اطلاع دی جائے۔ اس کے بعد منٹوں سیکنڈوں میں ہم نے جوابی حملہ کرنا تھا۔ کیونکہ جاپانی زمین میں گھسنے کے بہت ماہر تھے۔ ایک دو فٹ بھی زمین کھود لیتے تو ان کو نکالنا قریباً قریباً ناممکن تھا۔ پھر سوائے پوزیشن چھوڑنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن ان کے اتنے نزدیک ہونے کے بعد پوزیشن چھوڑنا بھی خودکشی تھا۔ میں نے دو پلاٹون کو جوابی حملے کی تیاری کا حکم دیا۔ سرداروں سے ان کی رائے دریافت کی تو انہوں نے وہی جواب دیا جو جنگل کی لڑائی کے بارے میں سرکاری کتاب میں لکھا تھا یعنی داہنے بائیں سے ہو کر جاپانیوں کے پہلو میں حملہ کیا جائے۔ لیکن پہاڑی (Ridge) کی چوٹی صرف پچیس تیس گز چوڑی تھی اور دونوں طرف ڈھلوانیں اتنی سیدھی تھیں کہ پہلو سے ہو کر آنا پہاڑی (Ridge) پر دوبارہ چڑھنے کے مترادف تھا۔ جاپانیوں نے تجربے سے دیکھ لیا تھا کہ یہ مہنگا سودا تھا چنانچہ وہ اب سیدھے آ رہے تھے۔ میں نے سرداروں کو یہ بات سمجھا دی اور حکم دیا کہ جوابی حملہ سیدھا روبرو ہوگا۔ اس تیاری کے بعد ٹن کر بیٹھ گئے۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب آٹھ سو گز والا پٹرول واپس آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ جاپانی پہاڑی (Ridge) کے اوپر ہی اوپر چھپ چھپا کر آ رہے ہیں۔ انہوں نے چہروں پر رنگ ملا ہوا ہے۔ ہم نے پہلے سمجھا تھا ہندوستانی ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا تو جاپانی تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چار سو گز پر جو پٹرول تھا وہ بھی واپس آ گیا ان کی رپورٹ بھی یہی تھی۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ میری پوزیشن کے جنوبی سرے پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ کمپنی میں جوش بہت بڑھ گیا ''نعرہ تکبیر۔ اللہ اکبر''، ''سیتا رام جی کی جے''، ''جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال''، ''بولو نعرہ حیدری۔ یا علی''، ''سی کمپنی کی جے''، ''اور اسحاق صاحب کی جے'' کے نعرے گونجنے لگے۔ ڈوگروں کا ایک خاصا لمبا چوڑا نعرہ تھا جو میں بھول گیا ہوں جس میں بہت سے دیوی دیوتاؤں کی صفات بیان کرنے کے بعد ''ہنومان جی کی ہُر'' آتا ہے۔ نعرے صوبیدار ہبرت سنگھ کی لیڈری میں بلند ہو رہے تھے۔ کمپنی میں ڈوگروں کے علاوہ مَیں اور میرا اردلی خدا بخش دو مسلمان تھے۔ میرا خانسامہ جو ہانس عیسائی تھا۔ مارٹر چلانے والے بارہ آدمی سکھ تھے۔ البتہ سب مل کر ہر قسم کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ اس منظر نے مجھے بہت مسرور کیا۔

اب جاپانی مارٹروں کی فائرنگ شروع ہو گئی۔ صحیح آبزرویشن پوسٹ (Observation Post) نہ ہونے کی وجہ سے ان کے گولے دریا کے پار گر رہے تھے۔ ہم نے مشہور کر دیا کہ ہمارے مارٹر ہیں جو دریا کے پار سے گولے پھینک رہے ہیں اور بٹالین کی طرف سے کمک پہنچ گئی ہے۔ اس سے جوانوں کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے۔ اب جاپانیوں کے گولے نزدیک پڑنے لگے۔ ممکن تھا کہ ان کے اگلے سپاہیوں نے گولوں کے گرنے کی رپورٹ واپس بھیجنا شروع کر دی تھی۔ جاپانی اکیاسی ملی میٹر دہانے کا مارٹر استعمال کر رہے تھے۔ یہ تین انچ مارٹر سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے مارٹروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی پوزیشن سے مغرب کی طرف ''مزاوا'' گاؤں اور اس کے نواح میں دھواں پیدا کرنے والے گولے پھینکیں۔ چنانچہ اس طرف انہوں نے دھوئیں کی ایک دیوار کھڑی کر دی۔ ہوتا یہ ہے کہ جب فوج کی نقل و حرکت چھپانے کے لئے زمین درختوں یا جھاڑیوں کی آڑ نہ ہو تو دھواں پیدا کرنے والے گولوں کے ذریعے ایک مصنوعی آڑ بنائی جاتی ہے اور یہ عموماً حملے یا جوابی حملے کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جاپانیوں نے ہمارے اس دھوئیں سے یہی مطلب نکالا اور سمجھے کہ میں اس طرف سے جوابی حملہ کرنے والا ہوں۔ چنانچہ اُن کے مارٹروں کے تمام تر گولے میری پوزیشن سے ہٹ کر اس دھوئیں میں گرنے لگے۔ یہی میں چاہتا تھا۔ اب مارٹروں کو دوسرا حکم دیا کہ یہی دھوئیں کے گولے اس علاقے پر پھینکیں جہاں پر شبہ تھا کہ جاپانی حملے کے لئے گولہ بارود جمع کرتے رہے تھے۔ دھوئیں کے گولے فاسفورس سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں جس سے دھواں پیدا ہوتا ہے۔ یوں آگ پکڑنے والی چیزوں کو بہت جلد آگ لگ جاتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر قسمت نے یاوری کی اور جاپانی گولہ بارود کو آگ لگ گئی تو ہماری مشکلیں بہت حد تک دور ہو جائیں گی۔ ساتھ ہی ساتھ اس راستے پر بھی ملے جلے Smoke اور High Explosive کے گولے پھینکنے کا حکم دیا جو جاپانیوں نے ہماری طرف آنے کے لئے استعمال کیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہر طرف سے اطلاع آنے لگی کہ جاپانیوں کی بیلچوں سے زمین کھودنے کی آواز آ رہی ہے۔ میں نے ان دونوں پلاٹونوں کو جن کو پہلے سے تیار رہنے کا حکم تھا، حملے کا اشارہ دے دیا۔ میرے سپاہی خندقوں سے نکل آئے اور دشمن کی طرف بڑھنے لگے۔ بانس کا جنگل اتنا گھنا تھا کہ ہلنا بولنا ناممکن تھا۔ اس لئے سپاہی آگے کی طرف رینگ کر گھٹنوں کے بل اور بیٹھ کر جا رہے تھے۔ میں اپنے مورچے سے نکل کر پوزیشن کے جنوبی سرے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ کمپنی کے سینئر صوبیدار نے جس کی سرکردگی میں جوابی حملہ ہو رہا تھا اپنی ہی رائفل سے اپنا کان زخمی کر لیا

اور مرہم پٹی میں مشغول ہو گیا۔ میں نے وہیں سے اس کو سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ باقی ماندہ لوگ نہایت دلجمعی سے بڑھتے رہے اور دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ دستی بموں کا استعمال ہونے لگا۔ سپاہی بھیکم سنگھ کی بہادری کی خبریں آنے لگیں۔ اس نے جاپانیوں کی ایک مشین گن پکڑ لی تھی۔ اب دوسری کے درپے تھا اور ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مخالف جاپانی نے اس پر ایک دستی بم پھینکا جو اس کے سر کے اوپر ایک بانس سے ٹکرایا۔ بانس پیچھے کو دہرا ہو کر جو سیدھا ہوا تو بم واپس جاپانی پر گر کر پھٹ گیا۔ اب وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ایک جاپانی ہلکی مشین گن مل گئی ہے لیکن گرینیڈ ختم ہو گئے ہیں۔ میرے پاس دو گرینیڈ تھے جو اس کو دے دیئے۔ چند ہی منٹوں کے بعد اس نے وہ مشین گن لا کر میرے پاؤں میں پھینک دی۔ میں خوش خوش ڈھاکوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا کہ ایک گولی آئی اور میری داہنی بغل کے نیچے سے قمیض کو چیرتی ہوئی سن سے گزر گئی۔ معلوم ہوتا تھا کسی جاپانی نشانہ باز نے بھانپ لیا تھا۔ چنن سنگھ مارٹر کمانڈر منت سماجت کرنے لگا کہ صاحب آپ کے دم قدم سے بچاؤ کی صورت ہے مورچے میں آ جایئے۔ چنانچہ میں مورچے میں اتر گیا۔ میرے پاس دو مشین گنیں اور جاپانی رائفلوں کا انبار لگ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جاپانی حملے کا زور ٹوٹ گیا ہے۔

جاپانیوں کے زور ٹوٹنے کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اسے عرفِ عام میں امدادِ غیبی کہا جائے گا۔ ''اراکان'' کے علاقے میں سردی کے موسم میں بارش شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ جنگلوں میں گھاس، درختوں کے پتے اور ٹہنیاں بہت سوکھ جاتی ہیں۔ اگر کسی جگہ آگ لگ جائے تو منٹوں سیکنڈوں میں پھیل جاتی ہے۔ ہم نے فاسفورس کے گولے جو فائر کیے تو ان سے جاپانی گولہ بارود تو نہ اڑا لیکن اس علاقے میں جنگل کو آگ لگ گئی۔ اس نے اس سارے راستے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، جدھر سے جاپانی آگے بڑھ رہے تھے۔ جنگل گھنا تھا آگ کی شدت بھی اسی نسبت سے تھی۔ جاپانیوں کے گولہ بارود کا ذخیرہ اگر نہیں پھٹا تو ان کا وہ تمام گولہ بارود پھٹنا شروع ہو گیا جو وہ آگے لا رہے تھے۔ آگ اب گرجتی ہوئی ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ تپشوں سے ہمارے چہرے جلنے لگے تھے۔ جاپانی جو ہماری طرف تھے وہ ختم کر دیئے گئے جو آگ کی لپیٹ میں آ گئے وہ اس نے ختم کر دیئے ہوں گے۔ کچھ ایمونیشن پھٹنے سے ناکارہ ہو گئے ہوں گے۔ باقیوں ساتھیوں نے اس آگ کے سمندر کو طے کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بہر حال ان کی طرف سے فائرنگ بالکل بند ہو گئی اور ہم بھی آگ بجھانے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے حکم دیا کہ پوزیشن سے آگ کی طرف

کوئی چھ فٹ چوڑا راستہ بنا دیا جائے جس سے تمام گھاس اور سوکھی ٹہنیاں ہٹا دی جائیں۔ ایسا کرنے سے آگ رُک گئی۔

فرار

دفعتہً میں ایسا محسوس کرنے لگا گویا پبلک میں کپڑے اتار دیئے گئے ہوں۔ پوزیشن سے جنوبی اور مغربی جانب جنگل جل چکا تھا۔ محض بانسوں کے سیاہ ڈنٹھل کھڑے تھے۔ خود پوزیشن میں بانس تقریباً پانچ فٹ کی بلندی سے اس طرح اڑ گئے تھے جیسے کسی نے درانتی سے برابر رکھ کر کاٹ دیئے ہوں۔ گولہ بارود کا حساب لگایا تو معلوم ہوا پچاس راؤنڈ فی آدمی کے حساب سے گولیاں بچ گئی تھیں۔ دستی بم سونگھنے کو نہیں تھا اور دونوں مارٹروں کیلئے صرف اٹھائیس بم باقی تھے۔ یعنی بمشکل تمام ایک معمولی جھڑپ کا سامان تھا۔ تمام کی تمام کمپنی نے چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسلئے باوجود اتنی بڑی فتح کے میں نے اس پوزیشن کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ زخمی خچروں کو گولی مار دی گئی۔ تندرست خچر کو کھلا چھوڑ دیا تا کہ جہاں چاہے جائے۔ جاپانیوں کی رائفلیں اور دوسرا سامان دریا برد کر دیا گیا۔ کچھ آدمیوں کو حکم دیا کہ پوزیشن کے مشرق کی طرف دریا کے ساتھ ساتھ جائیں اور کوئی کشتی یا رافٹ جو بھی ملے لے آئیں۔ خوش قسمتی سے ایک کشتی اور ایک رافٹ نزدیک ہی سے مل گئے۔ وہ ان کو کھینچ لائے اور دوپہر کے دو بجے کے بعد ہم نے نکلنا شروع کیا۔ سب سے پہلے ایک پلاٹون کو دریا کے پار لگایا۔ پھر زخمی اور مارٹر ادھر اتار دیئے گئے اس کے بعد باقی کی کمپنی۔ یہ ساری کارروائی جاپانیوں کی طرف سے مزاحمت کے بغیر مکمل ہو گئی بلکہ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا ان کو خبر تک نہ ہوئی کہ ہم فرار ہو چکے ہیں۔

دریا کے دوسرے کنارے تربوزوں کا کھیت تھا۔ تربوز زیادہ تر کچے تھے۔ ایک آدھ پکا بھی ہو گا۔ سپاہیوں نے میرے احکام کو کوئی وقعت نہ دی اور یوں ٹوٹ پڑے گویا اسی کام کیلئے ہندوستان سے چل کر آئے ہوں۔ جب میں نے زیادہ شور مچایا تو تربوز کا ایک ٹکڑا مجھے بھی لا کر دے دیا۔ جب کھیت پوری طرح اُجڑ گیا تب آگے چلنے کو تیار ہوئے۔

ہمارے پاس پانچ زخمی ایسے تھے جو چل نہیں سکتے تھے۔ ان کو اُٹھانے کیلئے ایک وقت میں بیس آدمی درکار تھے اور ان بیس آدمیوں کا سامان اُٹھانے کیلئے دوسرے آدمی۔ مارٹر اور ان کا ایمونیشن اُٹھانے کو بہت سے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اس طرح تمام کی تمام کمپنی بہت لد پھد گئی۔ میں نے

سارا سامان تینوں پلاٹونوں میں تقسیم کر دیا کہ جیسے چاہیں اُٹھالیں۔اس کے بعد تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر پلاٹونیں روانہ ہوئیں۔

سڑک پر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہاڑی راستے چنے گئے۔ رہبری کیلئے وہ دونوں گومی (جن کا ذکر کر چکا ہوں) آگے ہو گئے۔کوئی دو میل چلے ہوں گے کہ سورج چھپ گیا اور جنگل میں اندھیرا گھپ ہو گیا۔ اتنا اندھیرا کہ واقعی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔اسی اندھیرے میں ایک پلاٹون کمپنی سے علیحدہ ہو گئی۔انہوں نے سمجھا پیچھے رہ گئے ہیں اس لئے تیز چلنے لگے اور بہت آگے نکل گئے۔ جب ہم آگے بھی نہ ملے تو ستانے کو رُک گئے۔اتنے میں ہم ان کے پاس پہنچ گئے۔وہ اتنے بدحواس ہوئے کہ آناً فاناً پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔یہ وہی پلاٹون تھی جو پہلے دن جاپانیوں سے ڈر کر بھاگ آئی تھی۔اس دن سے ڈر اس کی رگ رگ میں داخل ہو گیا تھا۔ جب تک لڑائی رہی یہ باقی کی دونوں پلاٹونوں سے ہٹی ہی رہی۔ بھاگنا تو اس کی عادت ہو گئی تھی۔اب ان لوگوں کو واپس بلانا بہت مشکل ہو گیا۔جنگل انسانی آواز سے مانوس نہیں ہوتا۔جب آدمی اونچی آواز میں بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام درخت، چرند پرند احتجاج کے طور پر جلوس نکالنے والے ہیں۔ چنانچہ ہم نے جاپانیوں کی نقل اُتارتے ہوئے جنگلی جانوروں کی بولیاں سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ آخر کار فاختہ کی گھگھوں گھوں پر اکتفا کیا تھا۔دونوں ہاتھوں کو ملا کر گول کر لیا جاتا ہے اور دونوں انگوٹھوں کی جڑ میں ایک سوراخ سے پھونک ماری جاتی ہے۔جس سے گھگھوں گھوں کی سیٹی بجتی ہے۔اب اس آواز کا استعمال کیا گیا۔رات کی تاریکی میں چاروں طرف سے فاختاؤں کی نقلی آواز آنے لگی اور بہت جلد سب لوگ آ گئے۔البتہ کمپنی کے ایک مشہور پہلوان صاحب کو واپس لانے میں بہت دیر لگی۔انہوں نے بھاگنے میں ساری پہلوانی صرف کر دی تھی اور بہت دور نکل گئے تھے۔میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ موٹے تازے لوگ امن کے دنوں میں جن کی مونچھوں سے خون ٹپکتا ہے میدانِ جنگ کے عموماً کچے ہوتے ہیں۔شاید اس لئے کہ اپنے جسموں کو اتنا پالتے اور پیار کرتے ہیں کہ ان کو خطرے میں ڈالنے سے گھبراتے ہیں۔ان کے مقابلے میں خاموش طبع اکہرے بدن کے لوگ بہت دفعہ غیر متوقع بہادری کر جاتے ہیں۔ سعدی کے اسپ لاغر اور گاؤ پرواری والا قصہ ہے۔

جنگل میں کچھ دیر چلنے کے بعد پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو گئی۔راستہ بہت تنگ تھا۔محض پگڈنڈی تھی جو سفید دھاگے کی طرح پہاڑ سے لپٹی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل زخمیوں کو اُٹھانا تھا۔دو آدمیوں کو آگے

اور دو کو پیچھے برابر برابر چلنا پڑتا تھا۔اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ایک دو دفعہ اُٹھانے والوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ سٹریچر گر پڑا اور اس کے ساتھ زخمی بھی۔ زخمی نے چلانا شروع کر دیا۔بس پھر کیا تھا گالیوں کی ایسی بوچھاڑ آئی کہ بے چارے کو ٹھنڈا ہونا پڑا جو اچھا شگون تھا۔لوگ مشکل میں جذباتی نہیں ہو رہے تھے بلکہ ان کا رویّہ نارمل تھا۔

پَو پھٹنے کے وقت ہم ایک پہاڑی گاؤں کے پاس پہنچے۔میں نے فوراً گھیرا ڈال لیا۔دن چڑھا تو تمام بالغ مردوں کی جبری بھرتی کر لی اور سامان ان کو اٹھوا دیا۔ آٹھ بجے کے قریب پڑاؤ کیا۔گاؤں سے کچھ چاول اور چند مرغیاں مل گئی تھیں۔کھانا پکنے لگا اور ہم ستانے لگے۔نیچے میدان کی طرف نگاہ ڈالی تو ''می چانگ'' کی ندی اور اس کے پار اپنی پوزیشن کے بالکل پاؤں تلے نظر آئے۔ساری رات چلنے کے باوجود ہم نے بہت کم سیدھا فاصلہ طے کیا تھا۔دس بجے کے قریب کھانا کھا رہے تھے تو پہاڑیوں میں گونج پیدا ہو گئی۔دیکھا کہ پُرانی پوزیشن سے گرد و غبار کے بادل اُٹھ رہے ہیں۔جاپانی گولہ باری کر رہے تھے۔اچھا ہوا ہم وہاں نہیں تھے۔معلوم ہوتا تھا کہ جاپانی گولے صحیح نشانہ پر پڑ رہے تھے۔دوسرے دن ہم اس جگہ پہنچے جہاں کرنل نے بٹالین کو لانے کا کہا تھا۔سڑک کے راستے یہ جگہ ہم سے صرف دس میل دور تھی۔لیکن پہاڑوں میں سے ہو کر آنے میں دو دن لگ گئے تھے۔میں راستے میں ہر گاؤں کے لوگوں کی جبری بھرتی کر لیتا تھا۔اگلے گاؤں پہنچ کر پہلے گاؤں والوں کو چھوڑ دیتا تھا۔یہ لوگ سامان بھی اُٹھاتے تھے اور یرغمال کا کام بھی دیتے تھے۔اگر جاپانی پیچھا بھی کر رہے ہوں تو گاؤں والے ان کو اپنے ہی مردوں کے پیچھے لگانے والے نہیں تھے۔

اس جگہ مورچے بنے ہوئے تھے لیکن بٹالین کا نام و نشان نہیں تھا۔ہم نے فیصلہ کیا کہ سفر جاری رہے۔کوئی آدھی رات گئے لوگ بہت تھک گئے اور چلنے سے انکار کرنے لگے۔ایسے وقت میں پڑاؤ کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ بہت حوصلہ دیا ڈرایا دھمکایا لیکن لوگوں میں جان نہ آئی۔صوبیدار بھرت سنگھ کو دور کی سوجھی۔ایک آدمی کو روک لیا کہ جب کمپنی کوئی ایک سو گز آگے نکل جائے تو ایک راؤنڈ ہوا میں فائر کر دے۔گولی کی آواز آنے پر یہ پھیلا دیا کہ دشمن آ پہنچا ہے۔بس پھر کیا تھا معلوم نہیں کہاں سے لوگوں کی ٹانگوں میں اتنی جان آ گئی۔میرے لئے بھرت سنگھ کے لیے اور دوسرے دو چار لوگوں کے لیے جو شریکِ راز تھے مشکل آ پڑی کہ ہم باقیوں کا ساتھ کیسے دیں۔

سورج نکلنے سے پہلے ہم اس میدان میں پہنچے جو پلیبوا (جہاں سے ہم 5 مارچ کو میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے تھے) سے کوئی دو میل باہر تھا۔یہاں بٹالین نے ایک چھوٹا سا ہوائی اڈا بنا لیا تھا

جہاں چھوٹے جہاز زخمیوں کو باہر لے جانے کے لیے اُتر سکتے تھے۔ پاس ہی ایئر ڈراپ (Air Drop) کے ذریعے کوئی چار مہینے کے لیے راشن کا ذخیرہ بھی بنا لیا گیا تھا۔ چونکہ ہماری واپسی غیر متوقع تھی اس لئے اس ڈر سے کہ کہیں ہمارے لوگ ہمیں دشمن نہ سمجھ لیں ہم نے شور مچایا "ہم سی کمپنی ہیں"۔ لیکن ہماری آوازیں پہاڑیوں میں سے گھوم پھر کر واپس آ گئیں اور کوئی دوسری انسانی آواز سنائی نہ دی۔ ذرا آگے بڑھ کر پوزیشن میں پہنچے تو ایک طرفہ تماشا تھا۔ معلوم ہوتا تھا الف لیلہٰ کا کوئی شہر ہے۔ تمام دکانیں سجی پڑی ہیں لیکن کسی آدم زاد کا نام ونشان نہیں ہے۔ آٹے گوندھے پڑے تھے۔ چائے تیار تھی لیکن برتنوں میں پڑی پڑی ٹھنڈی ہو کر خراب ہو گئی تھی۔ افسروں کے بستر تیار تھے۔ مچھر دانیاں لگی ہوئی تھیں اور ان پر رات کو پہننے کے پاجامے ٹنگے ہوئے تھے۔ راشن اور ایمونیشن کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دوائیوں کے بکس بھرے پڑے تھے۔ نئے ماڈل کے وائرلیس سیٹ موجود تھے۔ سب لوگ سراسیمہ ہو گئے کہ کون سی بلا بٹالین کو چاٹ گئی ہے۔ میں نے حسبِ معمول ہر چیز کا اچھا پہلو دیکھنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے مشہور کر دیا کہ وہ ہماری امداد کو آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس سے یہ بھی مقصود تھا کہ جب تک پوری تحقیقات نہیں ہو جاتیں لوگوں کو بات چیت اور بحث مباحثہ کرنے کے لیے ٹھوس قسم کا موضوع مل جائے۔

یہ جگہ مدافعتی پوزیشن کیلئے مجھے پسند نہ آئی۔ اس لئے حکم دیا کہ وہاں سے شمال مغربی جانب کوئی دو میل کے فاصلے پر اسی پہاڑی پر ڈیرہ بنایا جائے جہاں بٹالین کو چھوڑ کر ہم آگے بڑھے تھے۔ یہ پہاڑی پلٹیوا کے قصبے کے مدِ مقابل دریائے "کلاوان" کے مشرقی کنارے پر تھی۔ حکم دیا کہ فی الحال سامان خورد ونوش اُٹھایا جائے۔ راستے میں ہمیں اس بات کا ثبوت مل گیا کہ بٹالین ہماری امداد کو آگے نہیں بڑھی تھی بلکہ پیچھے کو بھاگ گئی تھی۔ توپے، پراتیں اور دوسرا ایسا سامان جس کا خچروں پر لادنا ہمیشہ "کارے دارد" رہا ہے بکھرا پڑا تھا۔ ظاہر ہے جلدی میں سنبھالا نہیں گیا تھا۔

کمپنی نئی جگہ بنانے سنوارنے لگی اور میں کشتی میں بیٹھ کر پلٹیوا کے قصبے میں گیا۔ یہ ابھی تک آباد تھا جس سے اندازہ ہو گیا کہ جاپانی گردونواح میں نہیں تھے۔ تھانے سے معلوم ہوا کہ بٹالین پیچھے ہٹ گئی تھی اور پولیس والے بھی پسپائی کی تیاری میں تھے۔ ان لوگوں کے چہروں پر تمسخر تھا جو مجھے ذرا پسند نہ آیا۔

میں اس دن اتنا بھوکا تھا کہ یکے بعد دیگرے بند دودھ کے چھ ڈبے غٹا غٹ پی گیا۔ اس کے بعد مونگ کی دال سے بے شمار چپاتیاں کھا کر ہی صبر کیا۔ اس لئے کہ بھوک باقی تھی۔ باقی لوگوں کا بھی

یہی حال تھا۔ دستی بموں کے ذریعے دریا سے تازہ مچھلیاں پکڑی گئیں۔ سب نے نہا دھو کر ہفتے بھر کی میل اور تھکان دور کی۔ زخمیوں کو کشتیوں میں ڈال کر دریا کے راستے روانہ کر دیا گیا۔ دوپہر سے لے کر شام کے جھٹپٹے تک ذخیرے سے ایمونیشن اور راشن ڈھوتے رہے تا کہ نئی پوزیشن کو خوب مضبوط بنا لیا جائے۔

رات سونے میں معاً خیال آیا کہ ممکن ہے کسی دوسرے محاذ پر بہت بڑی مصیبت آ پڑی ہو اور بٹالین گھیرے سے نکلنے کیلئے پیچھے ہٹی ہو۔ میں یہاں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھ گیا ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی حکم دیا کہ کوچ کی تیاریاں کرو۔ چنانچہ روشنی ہونے سے پہلے پہلے ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ نکلنے کا راستہ ایسا چنا جو پلٹیوا سے نظر نہیں آتا تھا۔ تا کہ وہاں کا کوئی شب بیدار یا چوکیدار ہمیں نکلتے نہ دیکھ پائے۔ اس طرح وہاں پر ہماری حاضری کا بھرم کچھ گھنٹے قائم رہے۔

دو دن کی مسافت کے بعد ہم "ست یا نگ" پہنچ گئے۔ وہاں ان دنوں "تری پورا" رائفلو کی ایک بٹالین متعین تھی۔ انہوں نے ہمارا پُر جوش سواگت کیا۔ پوریاں کچوریاں پکائی گئیں۔ فروٹ کے ڈبوں کے ڈھیر لگ گئے۔ رائفلو کے کرنل نے حکم دیا کہ ہمیں جس قسم کا جتنا راشن چاہیے دے دیا جائے۔ ان لوگوں کی نظر میں ہمارا دوسرا جنم تھا۔ اس لئے کہ ان تک جتنی رپورٹیں پہنچی تھیں ان کے مطابق ہماری کمپنی ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ بعض روائتیں تھیں کہ ہم "آخری آدمی آخری راؤنڈ" پر عمل کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ بعض کی اطلاع تھی کہ میں بچے کھچے چالیس آدمیوں کو لے کر پہاڑوں میں گھس گیا تھا۔ وہاں سے جاپانیوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہا تھا۔ ایک روایت تھی کہ میں قیدی بنا لیا گیا تھا اور جاپانیوں نے میری ہٹ دھرمی کی سزا کے طور پر میرے ہاتھ پاؤں کاٹ کر درخت پر اُلٹا لٹکا دیا تھا۔ لوگ اس قسم کے قصے بتاتے تھے اور روتے تھے۔ انتظامی کمپنیوں کے ڈوگروں میں تو کہرام مچا ہوا تھا۔ اس لئے کہ ان کا سہارا رائفل کمپنی ہوتی ہے۔ ڈویژن کور اور آرمی کے اطلاع ناموں میں میری کمپنی کو گم ظاہر کیا گیا تھا۔ ایک دوسری رپورٹ میں تھا کہ جاپانیوں کے حملے میں روندی گئی ہے۔

ایک دن کی مزید مسافت کے بعد ہم بٹالین پہنچ گئے تو لوگ بہت خوش تھے۔ صرف گنتی کے کچھ چہرے ایسے تھے جو باہر سے شگفتہ اور اندر سے ملول تھے۔ انگریز ایجوٹنٹ (Adjutant) نے چھوٹتے ہی شکایت کی کہ چونکہ میں اپنی کمپنی کا تمام ریکارڈ ساتھ لے گیا تھا اس لئے وہ ہمارے لواحقین کو ہمارے گم ہونے کی اطلاع نہ دے سکا۔ میں نے بظاہر معذرت کی۔ لیکن دل چاہتا تھا کہ

تھپڑ رسید کروں۔ کرنل نے میرا نمبر کاٹ کر ایک دوسرے کو کپتان کے عہدے پر ترقی دے دی تھی۔ میں نے پوچھا تو فرمایا تمہارے لئے تو میدان کھلا پڑا ہے۔ یہ بیچارہ اپنے منتہیٔ مقصود کو پہنچ گیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کرنل کو میری موت کا یقین آ چکا تھا لیکن کس منہ سے کہتا۔ دوسرے آدمی کو ترقی اس لئے دی تھی کہ اس حادثے کے آثار جلد از جلد مٹ جائیں اور خلا پوری ہو جائے۔

بٹالین کا بھاگ نکلنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جنگل کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ پر قابو نہ رکھے تو ذہن میں طرح طرح کے بھوت آباد ہو جاتے ہیں۔ جو تصور میں طلسماتی رنگ سے آتے ہیں اور عجیب عجیب کشف ہونے لگتے ہیں۔ جاپانیوں کے مقابلے میں تین سال سے انگریزی فوج کے ساتھ یہی ہوتا آیا تھا کہ نہ صرف کسی جاپانی کا دیدار کیے بغیر سینکڑوں میل پیچھے ہٹ آتی تھی بلکہ بے حساب گولہ بارود بھی صرف کر ڈالتی تھی۔ چار مارچ کو افریقی ڈویژن پر حملہ ہوا تو بہت سے افریقی اُلٹے پاؤں بھاگے اور ہماری بٹالین میں پہنچ گئے۔ ان میں ایک انگریز میجر صاحب تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ مارچ کو ہمارے گردونواح میں تھے۔ اس شام کو ہمارے مارٹروں کی دھاڑ سُنی تو سمجھے جاپانی ہمارا قلع قمع کر رہے ہیں۔ رہی سہی کسر اپنی طرف سے پوری کر کے رپورٹ دے دی کہ ہمارا تو خاتمہ بالخیر ہو گیا ہے اور ایک جاپانی بریگیڈ پورا چلا آتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا بریگیڈ افریقی ڈویژن کے کریا کرم کے بعد کوئی بیس میل مغرب کو ایک راستہ پر چلا دیا۔ ہمارے بٹالین کمانڈر کو یقین ہو گیا کہ گھیرا پڑ رہا ہے۔ اس لئے ڈنکرک کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے سامان جوں کا توں چھوڑا اور جانوں کو لے کر کوئی پچاس میل پیچھے ایسے مقام پر جا بیٹھے جہاں دونوں راستوں کا اتصال ہوتا تھا۔ میرے دو جاٹ خچر پاتری جو پہلے دن کی جھڑپ کے بعد بھاگ گئے تھے انہوں نے بھی اپنا بھاگنا حلال کرنے کے لیے ہمیں کیفرِ کردار کو پہنچا دیا۔ کرنل صاحب نے کچھ پٹرول باہر بھیجے تو ان کو جنگل کی کچھاؤں میں جاپانی نظر آئے جن کے پاس بڑے بڑے کتے تھے۔ چنانچہ ہفتخواں کے جنوں بھوتوں دیوؤں اور دوسری طلسماتی الاؤں بلاؤں نے ذہنوں پر اس طرح گھیرا ڈالا کہ اس کو توڑنے کے لیے بٹالین کی بٹالین سر پٹ بھاگی اور پچاس میل جا کر رکی۔ راستے میں دو فیلڈ ہسپتالوں کا سامان ڈویژن کا چار ماہ کا سپلائی کا ذخیرہ اور دوسرا لاکھوں روپے کا سامان دریا برد کیا یا توڑ مروڑ دیا تا کہ دشمن کے ہاتھ نہ آ سکے۔

میری بہت شہرت ہو گئی۔ کور کے جنرل صاحب نے بلایا اور تین دن تک اپنا مہمان خاص رکھا۔ میری غیر حاضری میں کمپنی اس کے ایک سابقہ انگریز کمانڈر کے حوالے کی گئی۔ لیکن وہ نہ چل سکا۔

اس لئے کہ اپنے آدمیوں سے مشورہ نہیں کرتا تھا اور ان کو اب مجھے مشورہ دینے کی لت پڑ گئی تھی۔ قدم قدم پر ٹوکتے تھے کہ صاحب یوں نہیں یوں ہونا چاہیئے۔ میری واپسی تک وہ کافی تنگ آ چکا تھا۔ اس لئے بغیر دکھ تکلیف کے میرے حق میں دستبردار ہو گیا۔

اب ساری بٹالین کو آگے بڑھنے کا حکم ملا اور واپس ''می چانگ'' کی ندی کے کنارے میری پوزیشن کے بالمقابل پہنچے۔ پوزیشن بالکل لنڈ منڈ تھی۔ وہاں سٹرانڈ پیدا ہو گئی تھی۔ پھر جون کے آخر تک وہی فاصلہ جو بٹالین نے ایک دن میں طے کیا تھا ایک میل دو میل روزانہ کے حساب سے طے کرتے رہے۔ جاپانیوں سے ہر روز مڈھ بھیڑ ہوتی تھی۔ ایک دو جھڑپوں کے بعد ہم پیچھے ہٹ آتے، دوسرے دن یہی کاروائی دہرائی جاتی تھی۔ بہادر کیسر سنگھ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ میرے ہاتھوں اس طرح کہ جس کام کے لیے میں نے اُسے بھیجا تھا اُس میں بچنے کا چانس صرف اور صرف دس میں سے ایک تھا جو اس کے خلاف پڑا۔ کئی دوسرے سورماؤں نے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑا۔ دو آدمی اُس دن مارے گئے جس دن ہمارے لئے میدانِ جنگ کو چھوڑ دینے کے احکام آ چکے تھے۔

لیفٹیننٹ بائنڈ نے جسے میرے ساتھ شروع میں بھیجا گیا تھا خودکشی کر لی۔ جب چھ مارچ کو میں نے اُسے رپورٹ دے کر پیچھے بھیجا تھا تو وہ جنگل میں راستہ بھول گیا تھا۔ کئی دنوں کی سرگردانی کے بعد بٹالین کے مقام پر پہنچا تو وہی الف لیلٰہ کے شہر کا منظر تھا جو میں بیان کر چکا ہوں۔ اس خوش فہمی میں رات کاٹی کہ بٹالین آگے گئی ہے۔ جب دوسرے دن اطلاع ملی کہ بٹالین فرار ہو گئی ہے تو سمجھا موت ''یا'' جاپانیوں کی قید کے علاوہ تیسری صورت نہیں ہے تو موت کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے ہی پستول کی نذر ہو گیا۔

مجھے ملٹری کراس (Military Cross) سے نوازا گیا۔ کمپنی کے دوسرے بہت سے لوگوں پر بھی انعام واکرام کی بارش ہوئی۔

باب نمبر 8

موازنہ

ستمبر 1944ء میں ہماری بٹالین ایک مہینے کی چھٹی اور ایک مہینے سے کچھ اوپر ستانے اور ساتھ ہی ساتھ دوبارہ کیل کانٹے سے لیس ہونے کے بعد بنگال کے جنوب مشرقی کونے میں ''ماتگڈا'' کے مقام پر بھیج دی گئی۔ اس دوران میں میں ایجوٹنٹ (Adjutant) بنا دیا گیا تھا۔ کرنل اور ایجوٹنٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے لیکن ہماری ایک دوسرے سے نہیں نبھتی تھی۔ یہ نئے کرنل اگر بیمار نہ ہوتے تو بریگیڈیئر بن جاتے جس کے لیے احکام جاری ہو چکے تھے۔ نئے کرنل پہلے ہماری بٹالین کے سیکنڈ اِن کمانڈ (Second-in-Command) تھے۔ مئی اور جون میں کرنل کو ہماری بٹالین، ایک افریقی بٹالین اور تری پورا رائفلز تینوں پر کمانڈر بنا دیا گیا تھا۔ اس طرح ان دنوں سیکنڈ اِن کمانڈ صاحب بٹالین کی سپہ سالاری کرتے رہے۔ جب کرنل نے مجھے ایجوٹنٹ بنانا چاہا تو میں نے سیکنڈ اِن کمانڈ صاحب کی حاضری میں معذرت چاہی اور بغیر لگی لپٹی رکھے کہا کہ چونکہ کرنل کی ترقی ہونے والی تھی اس لئے درحقیقت مجھے سیکنڈ اِن کمانڈ صاحب کی ایجوٹنٹی کرنی پڑے گی؟ میدانِ جنگ میں بھی جہاں زندگی اور موت کی کشمکش چھوٹی چھوٹی ذاتی کدورتوں کو دبائے رکھتی ہے ہماری نہیں بنتی تھی۔ جنگ کے بعد ہم میں اتنا قریبی رشتہ جوڑنا نہ تو سیکنڈ اِن کمانڈ کے لئے قرینِ انصاف تھا نہ مجھ پر احسان۔ لیکن کرنل نے حسبِ معمول ''بکواس بند کرو'' کہہ کر مجھے چپ کرا دیا تھا۔ سیکنڈ اِن کمانڈ صاحب منہ سے تو کچھ نہ بولے لیکن جس طرح جبڑے ہلا رہے تھے اس سے صاف ظاہر تھا کہ دانت پیس رہے ہیں۔

جنگ میں میری اور ان کی اصول کی لڑائی تھی۔ ہمارے لئے حکم تھا کہ جاپانیوں کو مون سون شروع ہونے تک برما اور ہندوستان کی سرحد کے اس پار رکھنا ہے۔ اس کے بعد ہم نے میدانِ جنگ سے

باہر نکل آتا تھا۔ اس لئے کہ برسات شروع ہونے کے بعد ''اراکان'' میں لڑنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جاپانیوں پر ہمارا رعب ہو گیا تھا اور وہ سر نہیں آتے تھے۔ اس کے علاوہ ہماری ہوائی فوج کو برتری حاصل تھی اور جاپانی دن کے وقت نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ہوائی جہازوں کا ایک سکواڈرن ہر وقت ہماری مدد کو تیار رہتا تھا۔ جونہی ہمیں کسی جگہ پر جاپانیوں کے جمع ہونے کی اطلاع ملتی تھی یہ ابابیلوں کی طرح بموں اور مشین گنوں سے تواضع کرنے کے لئے آ جاتے تھے۔ ایک دو تو دیکھ بھال کے لئے ہر وقت سر پر منڈلاتے رہتے تھے۔ جاپانیوں کے لئے سپلائی کی بھی مشکلات تھیں۔ ہمیں ہوائی جہاز وافر سپلائی پہنچاتے رہتے تھے۔ ان حالات میں ہمیں جو کام سونپا گیا تھا وہ کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ ہمارے سامنے دو بڑے مقاصد رہ گئے تھے۔ اپنے لوگوں کو زیادہ تھکائے اور نقصان اُٹھائے بغیر بچالانا تاکہ آنے والے فوج کشی کے موسم میں جی لگا کر لڑ سکیں اور جاپانیوں کو علاقے کے عوض میں زیادہ سے زیادہ جانی نقصان پہنچانا۔

ان باتوں کے پیشِ نظر میں بے مقصد بہادری کے خلاف تھا اور جو کام بے جگری کی جگہ عقل سے نکل سکتا تھا نکالنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن سیکنڈ اِن کمانڈ کو یہ پالیسی راس نہیں بیٹھتی تھی۔ اسے نئی نئی کمان ملی تھی۔ لڑائی میں روز روز موقعے نہیں ملتے۔ اگر اس موقع پر کچھ نہ کر دکھایا تو آئندہ ترقی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اس لئے خوب ہلا گُلا چاہتا تھا۔ اگر اپنے آدمی مرتے یا زخمی ہوتے تھے تو بالکل ٹھیک تھا۔ اس لئے کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ لڑائی میں دشمن کا نقصان اپنے سے تین تا دس گنا تک دکھایا جاتا ہے۔ لیکن اپنے ہی آدمی مریں اور نہ زخمی ہوں تو دشمن کو کیسے مارا جائے۔ اوپر والے تو میدانِ جنگ میں حاضر نہیں ہوتے۔ دشمن کے نقصان کا اندازہ اپنے نقصان سے لگاتے ہیں۔ اس لئے اگر اپنے آدمیوں کو جوکھوں میں نہ ڈالا جائے اور ان کا تیا پانچہ نہ ہو تو ہنگامہ خیز معرکوں کی خبر کیسے بنائی جائے اور سیکنڈ اِن کمانڈ کو بہادری تدبر اور سپہ گری کے فن میں مہارت کی سند کیسے ملے۔ جو بوقتِ ضرورت کام آ سکے۔

بٹالین کمانڈر کے پاس اپنا تو کوئی آدمی ہوتا نہیں اسے سب کام کمپنی کمانڈروں سے لینے ہوتے ہیں۔ یہاں میری اور سیکنڈ اِن کمانڈ صاحب کی چپقلش شروع ہوتی تھی۔ لڑائی میں عام قاعدہ ہے کہ ایک دفعہ کوئی اچھا کام کر لے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس پر بہادری کی مہر لگ گئی ہے۔ اب اسے جس کام میں چاہو گھسیٹ لو۔ ہمیشہ بہادر رہے گا۔ اس طرح میں نے کیسر سنگھ کو مروا دیا اور اسی طرح دوسرے کمپنی کمانڈروں نے بھی بعض بہادروں کا ایسا ناس کیا کہ اُنہوں نے تنگ آ کر اپنے

آپ کو زخمی کر لیا جو نہ پکڑے گئے ہسپتال میں نکل گئے۔ جن کا پتہ چل گیا ان کے کورٹ مارشل ہوئے اور سارے کیے کرائے پر پانی پھیر لیا۔ میری کمپنی چونکہ سرخروئی حاصل کر چکی تھی اس لئے سیکنڈ اِن کمانڈ صاحب کا رجحان یہی تھا کہ مجھ پر زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے۔

ٹیلیفون ایکسچینج (Telephone Exchange) بھاری بھر کم چیز ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اس کی بجائے ایک ٹیلیفون سے سب ٹیلیفون جوڑ کر ایکسچینج کا کام لیتے تھے۔ اس میں قباحت یہ تھی کہ جب دو ٹیلی فونوں پر بات ہو رہی ہوتی تو سبھی سُن سکتے تھے۔ سیکنڈ اِن کمانڈ ہر روز شام کو سب کمپنی کمانڈروں کو ان کے ٹیلی فونوں پر بلا کر احکام دیا کرتے تھے۔ جس دن مجھے کھٹکتی تھی کہ زیادتی ہونے والی ہے تو گفتگو اس قسم کا رنگ پکڑ لیتی تھی۔

سیکنڈ اِن کمانڈ۔ اسحاق

میں۔ جناب

س۔ ان۔ ک۔ کل اتنے آدمی بھیجو جو فلاں فلاں مقام کی چھان بین کر کے آئیں۔

میں۔ ہلو۔ کیا فرمایا آپ نے؟

س۔ ان۔ ک۔ (حکم دہراتے ہیں)

میں۔ ہلو۔ کچھ بھی تو سنائی نہیں دیا۔ یہ حرامزادے ٹیلی فون۔ ہلو ہلو ہلو۔ کیا فرمایا جناب نے؟ اس طرح کی گفتگو جاری رہنے کے کچھ دیر بعد سیکنڈ ان کمانڈ۔ پیارا؟ پیارا سنگھ (ایک دوسرا کمپنی کمانڈر) جناب

سیکنڈ اِن کمانڈ۔ (میرے والا حکم اسے دیتے ہیں)

میں (اس دوران میں ٹیلیفون کو گالیاں دیتا رہتا ہوں) ہلو۔ ہلو۔ اب بہتر ہے۔ آپ کیا فرما رہے تھے جناب؟

سیکنڈ اِن کمانڈ۔ کچھ نہیں۔

اس طرح یہ قضیہ ختم ہو جاتا ہے۔ یوں کمپنی کمانڈروں کو ہنسی مذاق کیلئے موضوع مل جاتا۔ سبھی اس سے تنگ تھے۔

وائرلیس بھی ہمارے پاس تھے لیکن یہ استعمال نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک تو اسلئے کہ جاپانیوں کے ساتھی انڈین نیشنل آرمی کے آدمی ہماری بات سُن لیتے تھے۔ دوسرے وہ ہمارے سیٹ جام (Jam) کر دیتے تھے۔ اسلئے ہم وائرلیسوں سے صرف اپنے سگنل آفیسر .... خان سے ہیر

سننے کا کام لیتے تھے جس کے لئے آئی این اے (I.N.A) والے بھی موقع ملنے پر وائرلیس کے ذریعے فرمائشیں کرتے رہتے تھے۔

سیکنڈ اِن کمانڈ صاحب سمجھتے تھے کہ چونکہ میں کامیابی کی چھاپ حاصل کر چکا تھا اس لئے اس کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ میں ہندوستانی تھا، انگریز نہیں تھا۔ میں تیل کے چشموں، خام مال کے ذخیروں، صنعتی مال کیلئے منڈیوں، سفید فام لوگوں کی برتری اور شہنشاہیت کیلئے نہیں لڑ رہا تھا۔ میری نظر میں کوئی فوجی مقصد نہیں تھا۔ فوج میں آ گیا تھا اسلئے ڈیوٹی بھگتا رہا تھا۔ میرے دل میں جاپانیوں کیلئے نفرت ضرور تھی لیکن محبت انگریز کیلئے بھی نہ تھی۔ میں کِس ولولے کو لے کر اپنی کمپنی کو موت کے منہ میں جھونکتا۔ دوسری طرف انگریز قومی جذبے سے سرشار تھے۔ سالہا سال ہندوستانی فوج میں رہنے کے باوجود ان میں سے بہت کم کو ہندوستانیوں سے جذباتی لگاؤ تھا۔ کسی نے کہا ہے "گھوڑے کی ٹہل سیوا اس طرح کرو کہ جیسے لاکھوں کا مال ہے لیکن سواری ایسے کرو کہ جیسے دمڑی مول نہیں ہے"۔ ہماری نسبت ان کی یہی پالیسی تھی جس سے دکھ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ تو میرا کورٹ مارشل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک دن صبح کے وقت میری کمپنی کے ایک پٹرول نے جو دشمن کے علاقے کی دیکھ بھال کیلئے گیا تھا واپس آ کر اطلاع دی کہ ہماری ایک دوسری کمپنی کا ایک آدمی ان کی اگلی خندقوں میں مرا پڑا ہے لیکن کمپنی پیچھے ہٹ آئی ہے۔ میں نے اس کی اطلاع اوپر کر دی۔ اُنہوں نے متعلقہ کمپنی سے دریافت کیا۔ یہ الجھن میں پڑ گئے۔ اسلئے کہ صبح سویرے "سب اچھا" دے چکے تھے (یعنی رات بخیریت گزر گئی ہے) دراصل ان پر رات حملہ ہوا تھا جس سے ان میں بھگدڑ مچ گئی تھی اور یہ پیچھے ہٹ آئے تھے۔ بات چھپانے کیلئے "سب اچھا" کہہ دیا لیکن اب قلعی کھل گئی۔ اس دوران میں جاپانیوں نے نعش پر مشین گن لگا دی تھی اور یہ جو اسے واپس لانے کی کوشش کرتے تھے تو وہ پاس نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ سیکنڈ ان کمانڈ صاحب نے کسی وجہ سے سمجھ لیا کہ میری سرزنش کا اچھا موقع ہے۔ فوراً حکم دیا کہ جن لوگوں نے مردے کے بارے میں خبر دی ہے انہی کو مردہ لانے کیلئے واپس بھیجوں۔ میں نے جو تفتیش شروع کی تو ایک عجیب راز کھلا۔ ہمارے مقابلے میں جو آئی این اے (I.N.A) والے تھے، جنگل میں ان کی میرے لوگوں سے ملاقات ہو چکی تھی اور طرفین میں طے پایا تھا کہ حتی الوسع ایک دوسرے کو نہیں ماریں گے۔ اس دفعہ انہی لوگوں نے میرے آدمیوں کو دوسری کمپنی کے مردے اور جاپانی مشین گن کے بارے میں بتایا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ اسلئے کہ مجھ پر بھی یہ راز پہلی دفعہ کھلا

تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انگریز کو اطلاع ہو۔ اسلئے کچھ دیر کے بعد جھوٹ موٹ یہ قصہ بنا لیا کہ میرے آدمی دوبارہ گئے تھے۔ لیکن جاپانی مشین گن کی وجہ سے نعش حاصل نہیں کر سکے۔ سیکنڈ ان کمانڈ کی اس پر تسلی نہ ہوئی۔ جب اُنہوں نے زیادہ زور دیا تو میں نے یہ معذرت کی کہ جس نے مرنا تھا وہ تو مر گیا ایک مردے کیلئے زندوں کو کیوں موت کے منہ میں دھکیلا جائے۔ دوسرے اب اس کو حاصل کرنے کیلئے پوری کمپنی کے حملے کی ضرورت تھی جس کیلئے وہی کمپنی موزوں تھی جسکا مردہ تھا۔ لیکن سیکنڈ ان کمانڈ صاحب بضد رہے۔ کافی دیر ردوکد ہوتی رہی آخرکار میں نے کہا کہ معاملہ کرنل تک لے جایا جائے۔ اس پر سیکنڈ ان کمانڈ صاحب ٹھنڈے پڑ گئے۔ اسلئے کہ بظاہر ان کا رویّہ نہایت غیر معقول تھا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ ان کو میرے سپاہیوں اور آئی این اے والوں کی مفاہمت کی اطلاع ہو گئی تھی اور اس کی سزا دینا چاہتے تھے۔

"مانگڈا" تک پہنچتے پہنچتے ہمارے تعلقات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ ہم بہت کم ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ کرنل (وہ اب کرنل ہو گئے تھے) کا دفتر ایک ٹیلے پر تھا میرا ٹیلے کی ڈھلوان پر۔ سارے کاغذات اردلی کے ذریعے ایک دوسرے تک پہنچائے جاتے تھے۔ اردلی روم کے وقت (جب سزا یا ترقی یا کسی اور وجہ سے لوگوں کی پیشیاں کرنل کے سامنے ہوتی ہیں) میں غیر حاضر رہتا تھا۔ جلد ہی اس صورتحال کا تسلی بخش خاتمہ ہو گیا۔

ہوا یہ کہ جنرل سر آلیور ڈبلیو ایچ لیز (Sir Oliver W.H Leese) جنوب مشرقی ایشیا کی اتحادی بری فوج کے نئے کمانڈر انچیف تعینات ہوئے تو ان کو ایک ہندوستانی ایڈی کانگ کی ضرورت پڑی۔ پہلے جنرل صاحب کے اے ڈی سی اودے پور کے "یوراج" تھے۔ نئے صاحب کو ایک سپاہی کی تلاش تھی۔ کور ہیڈ کوارٹر سے پوچھا گیا تو اُنہوں نے میرا نام تجویز کیا۔ وہاں سے ڈویژن، ڈویژن سے بریگیڈ، بریگیڈ سے بٹالین اور آخر میں مجھ سے دریافت کیا گیا۔ میں نے رضامندی کا اظہار کیا۔ جنرل صاحب ان دنوں ہمارے علاقے کے دورے پر تھے۔ حکم آیا کہ ملاقات کیلئے پیش ہو جاؤ۔ کرنل صاحب نے نیک دعاؤں کے علاوہ ایک رپورٹ بھی پیش کر دی کہ پندرہ سال کی ملازمت میں مَیں نے ایسا اچھا انڈین افسر نہیں دیکھا۔ میں انہی دنوں میجر ہوا تھا اور کمبل کے ٹکڑے کا تاج کاٹ کر کندھے پر لگایا ہوا تھا۔ جنرل صاحب نے دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ سپاہی ہے۔ فرمانے لگے میرے پاس آنے کیلئے میجری چھوڑنی پڑے گی کیونکہ ایڈی کانگ کی جگہ صرف کپتان کیلئے ہے۔ میں نے کہا میجری سے کہیں بڑی عزت ایک عظیم سپاہی کا

قرب ہے۔ یہ سن کر موصوف پھڑک ہی تو گئے۔ چائے کا وقت آیا تو جنرل صاحب اور ان کے سٹاف کے آدمی اور میں میز پر بیٹھ گئے۔ میں نے چائے دانی میز پر اُلٹ دی اور چاروں مسکرانے لگے۔ پھر میں نے اس دلجمعی سے معذرت کی کہ سب ہنسنے لگے۔ میرے سپاہی ہونے کے ثبوت میں رہی سہی کسر نکل گئی اور نظرِ انتخاب مطمئن ہو گئی۔

میدانِ جنگ میں فرنیچر تو تھا نہیں اس لیے بانس کاٹ کر اس کی چپٹیوں سے میزیں بنچیں اور چارپائیاں بنالی جاتی تھیں۔ اب جو بارک پور پہنچا تو فلیگ سٹاف ہاؤس نام کے ایک محل میں قیام ہوا۔ صوفے اتنے سپرنگ دار تھے کہ بیٹھتے وقت بڑا ڈر لگتا تھا کہ کہیں سپرنگ نہ ٹوٹ جائیں۔ وہاں چھ مہینے رہا لیکن یہ اضطرابی کیفیت دور نہ ہوئی۔ ذہنی تھکا (Anxiety) جسمانی گھبراہٹ سے بھی بڑھ کر تھا۔ جنگ میں زندگی کا فارمولا بہت آسان بن جاتا ہے اور سوشل رکھ رکھاؤ بات چیت اور تعلقات سیدھی سادی بے لاگ شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں پھر سے بات کو تولنا پڑا۔ لوگوں کی قدر و منزلت کے مختلف درجے دھیان میں رکھ کر نشست و برخاست اور گفتگو کے مختلف خاکے (Patterns) اختیار کرنے پڑے۔ مبتدی کو لطفِ محفل بھی کوفت کے بغیر نہیں ملتا۔

یہاں مجھے اپنی اصلی اوقات کا بہت شدت سے احساس ہوا اور اس کا بھی کہ اپنے ہی دیس میں آدمی غریب الوطن کیسے ہوتا ہے۔ میری ''غربت'' دوہری تھی۔ ایک ایسی جس میں سب انڈین مبتلا تھے۔ یہ واقعہ تھا کہ اس دیس میں ایک انگریز کو جو مراعات حاصل تھیں بڑے سے بڑا انڈین بھی ان سے محروم تھا۔ جو کام مقامی باشندوں کے بارے میں تھے ان کو بھی ایک انگریز زیادہ آسانی سے سرانجام دے سکتا تھا۔ چنانچہ میری حیثیت ایک نشان کی تھی۔ شاید میں اٹلانٹک چارٹر (Atlantic Charter) کا مظہر تھا یا ایشیا کی اُٹھتی ہوئی قوم پرستی کا احساس۔ میری افادی حیثیت اور کچھ نہ تھی۔

میری دوسری غربت زیادہ گھمبیر تھی۔ شروع شروع میں انگریز مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ مجھے راجہ صاحب کہیں یا نوابزادہ صاحب۔ بعض نے اس توقع کا اظہار بھی کیا کہ ان کیلئے شکار وغیرہ کا انتظام کروں اور اپنی جاگیر پر لے جاؤں۔ انڈین مصنوعات کے تحفے پیش کروں۔ میں ان سب چیزوں کے بارے میں عاجز تھا۔ میں تو میدانِ جنگ کا افسر تھا اس سے باہر صفر۔ معلوم ہوتا تھا انگریز کلکتہ میں نہیں اُترے ہوئے اور میں مانچسٹر میں مقیم ہوں۔ چند ہی دنوں کے بعد مجھے اس کیمپ کے انتظام کیلئے بھیج دیا گیا جو جنرل صاحب نے برما میں چودھویں فوج کے دورے کیلئے اس

کے ہیڈکوارٹر میں کھولا ہوا تھا اور جہاں وہ اکثر آ کر رہتے تھے۔

اس زمانے میں مَیں سمجھتا ہوں مجھے ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت کے بہت اچھے موقعے میسّر آئے۔ فوجی نکتہ نظر سے میرے لئے یہ قیام بہت مفید تھا۔ میں کوئی تین سال میں لڑائی کے فن کے بارے میں ابتدائی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ تھوڑا سا جنگ کا تجربہ بھی ہو گیا تھا لیکن میرے خیالات اور تجربوں میں وسعت نہیں آئی تھی۔ یہاں صبح کے وقت ہم سب ایک دیوار قد نقشے پر پچھلے چوبیس گھنٹے کی جنگ کی کاروائی کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اسے ''صبح کی نماز'' کہا جاتا تھا اور اُسکی ادائیگی سب پر فرض تھی۔ اتنا بڑا نقشہ ہونے کے باوجود فوجوں کے نشانوں سے اس طرح اَٹا پڑا تھا کہ کمپنی کی پوزیشن کے تو نشان بھی کم ہی بنائے جاتے تھے۔ اس سے میں بہت مرعوب ہوا۔ گو مسمار نہیں ہوا۔ نئی نئی بانگ دینے والے چوزے کے سامنے ہزاروں اس جیسے یا اس سے بڑے چوزے جمع کر دئے جائیں تو وہ بانگ دینے سے باز نہیں آ جاتا۔ اتنا پتہ بھی چل گیا کہ جس کو میں منزل سمجھتا تھا وہ پہلا قدم تھا۔ زندگی کے اس سے بھی بڑے داؤ تھے جس پر لوگ بڑی بڑی پونجیاں لگا دیتے ہیں اور بار بار لگاتے ہیں۔

کامیاب جرنیلوں کی صحبت بھی فوجی تعلیم کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ ان لوگوں نے بڑے بڑے تجربے ہضم کئے ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو ان سب کا نچوڑ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو جرنیلوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ چیف کا حکم تھا کہ مختلف محکموں کے سربراہ ان سے ملاقات کے وقت فائل ساتھ نہیں رکھیں گے۔ چنانچہ بیچاروں کو فائلیں پڑھ کر آنا پڑتا تھا۔ ایسی صورت میں لال بجھکڑ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ چنانچہ کمانڈ کے پہلے دو مہینوں میں چیف نے دو سو سے اوپر لال فیتے والے افسروں کو اپنی نظروں سے دور کر دیا اور صرف کام کے لوگوں کو اپنے پاس رہنے دیا۔ صوفیوں کے ہاں کہاوت ہے کہ

یک زمانہ صحبتے با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اس کی صداقت ان جرنیلوں کو دیکھ کر مجھ پر واضح ہو گئی۔ فنونِ جنگ کے رموز و نکات ان کی گھٹی میں تھے۔ جنگ کے بارے میں تازہ ترین خیالات، جرمنوں، جاپانیوں، اطالویوں، امریکیوں، روسیوں کے جنگی تجربات ان کی زبان پر تھے۔ جنگ کی بھٹی نے ان میں کچا مال جلا کر علیحدہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ان میں بڑے بڑے بوگس (Bogus) لوگ بھی تھے جو چرب زبانی یا ظاہری

آن بان یا سطحی کارگیری کی بدولت اعلیٰ عہدوں پر ڈٹے ہوئے تھے۔

نقدِ صوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد

اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

ترجمہ: صوفیاء کے ایسے بہت سارے لباس ہیں جنہیں آگ لگا دینی چاہیے۔

صوفی کا لباس ہمیشہ نیک و پاک نہیں ہوتا۔

وہاں رہ کر مجھے جو احساس بہت شدت سے ہوا وہ یہ تھا کہ انگریز کے ہاں قحط الرجال نہیں ہے۔ اس چھوٹی سی قوم میں اتنی تعلیم، اتنا تجربہ، اتنا سلیقہ آ چکا ہے اور اس قدر عام ہے کہ ایک جگہ خالی ہوتی ہے تو سینکڑوں اس کو پُر کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ یہی خود اعتمادی تھی کہ جنگ کے بعد چرچل کو ٹوٹا ہوا ٹینک سمجھ کر ایک کونے میں لگا دیا گیا۔

میرے اس سلسلہ تعلیم کی دوسری کڑی اپنے ملک پر حکمران قوم کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع تھا اور اس کے ساتھ ملی ہوئی ایک تیسری کڑی ان میں اور ہم میں تنظیم کے بارے میں صدیوں کے بُعد کی پہچان۔

ہم لوگوں میں انگریزوں کی برتری بارے مختلف خیالات موجود ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں ان میں اخلاقی اقدار ہم سے بہتر ہیں۔ ایثار کا مادہ زیادہ ہے، قومی یکجہتی ہے، تعلیم ہے، ہنر ہے۔

میرے خیال میں ان چیزوں میں بیشتر ایسی ہیں جو ہمارے مقابلے میں انگریزوں کی برتری کا سبب نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہیں۔ انگریزوں میں ایک دوسرے کے خلاف طبقاتی تعصب حد درجے کا ہے۔ میرے جرنیل صاحب خطاب یافتہ حکمران طبقے (Titled Aristocracy) سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اُنہوں نے اپنا سٹاف زیادہ تر ان لوگوں پر مشتمل کیا تھا جو اس طبقے کے چشم و چراغ تھے۔ ایک صاحب برطانیہ کی قدامت پسند جماعت یعنی ٹوری پارٹی کے سیکرٹری کے صاحب زادے تھے۔ دو تین دوسرے لارڈوں لیڈیوں کے بیٹے تھے۔ ان لوگوں کے ذہنوں میں دوسروں کے مقابلے میں اپنی برتری مسلّم تھی اور سمجھتے تھے کہ یہ دنیا انہی کی آسائش کیلئے ظہور میں آئی ہے۔ چنانچہ "بیرک پور" پہنچ کر مجھے جو سب سے پہلا صدمہ ہوا وہ ان لوگوں کی قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح تھی۔ فوج میں ایسے پمفلٹوں کی بھرمار تھی جن میں یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ قوم کے بھلے میں سب کا بھلا ہے۔ اس لئے جہاں قومی مصلحتوں اور ذاتی مفاد میں تضاد ہو وہاں ذاتی مفاد کو پسِ پشت ڈال دینا چاہیئے۔ ملک بھر میں اسی قسم کے اشتہاروں سے

پٹا پڑا مواد دستیاب تھا۔ لیکن یہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ ٹھنڈی کافی (Ice Coffee) کا درجۂ انجماد صحیح نہیں ہوتا تھا تو پیٹ اُٹھتے تھے۔ نہانے کیلئے ٹب نہیں ملتا تھا تو دنیا اندھیر ہو جاتی تھی۔ سرکاری گاڑیوں کا ذاتی کاموں میں کُھلا استعمال ہوتا تھا۔ اسٹیشن بھر کو چونا قلعی رنگ و روغن کی جو مقدار ملتی تھی اس میں سے بیشتر انہی لوگوں کی رہائش گاہوں میں صرف ہو جاتی تھی۔ اس طرح کئی بارکیں اور کنٹینیں میلی کچیلی رہ جاتی تھیں۔ یہی حال اور بہت سی چیزوں کا تھا۔ ولایت سے ایئر کنڈیشن کی دو مشینیں آ رہی تھیں جن کا دو فیلڈ ہسپتالوں کیلئے ایک عرصے سے انتظار تھا۔ لیکن ان لوگوں نے حکم دے دیا کہ فلیگ سٹاف ہاؤس کو ایئر کنڈیشن کر دیا جائے۔ ہسپتال والے پیٹ اُٹھے کہ میدانِ جنگ میں گرمی اور رطوبت کی وجہ سے کئی آپریشن خراب ہو رہے تھے اور بہت سی جانیں ضائع جا رہی تھیں۔ لیکن یہاں کون سُنتا تھا۔ میں بھول گیا ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوا لیکن میرے وہاں موجود رہنے تک فلیگ سٹاف ہاؤس کو ایئر کنڈیشن نہیں کیا گیا تھا۔ شاید وہ مشینیں جرمن آبدوز کشتیوں نے ڈبو دی تھیں۔

یہ بھی نہیں ہے کہ سیاسی اعتقادات انگریزوں میں ذاتیات کا رنگ نہیں پکڑتے۔ میرے جرنیل صاحب کنزرویٹو (ٹوری) پارٹی کے ہم خیال تھے۔ اس کے برعکس جنرل سلم جو چودھویں فوج کے جنرل آفیسر کمانڈنگ ان چیف تھے، لندن کے ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا رجحان لیبر (مزدور) پارٹی کی طرف تھا۔ جن دنوں میں وہ ملازمت کر رہا تھا تو ان دونوں میں اختلاف ہو گیا اور جنرل سلم کو انگلستان واپس جانا پڑا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب عام انتخابات میں لیبر (مزدور) پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو انہوں نے جنرل سلم کو بحال کر دیا۔ اس پر جنرل لینز صاحب کو استعفیٰ دینا پڑا اور انہوں نے اپنی زمین پر کھیتی باڑی کا کام سنبھال لیا۔

اسی طرح انگلستانیوں اور سکاٹ لینڈ کے باشندوں میں شدید اختلاف پائے جاتے ہیں۔ وہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جب کسی اسکاٹ پلٹن کی فٹ بال ٹیم کا کسی انگلستانی پلٹن کی فٹ بال ٹیم سے مقابلہ ہو رہا ہو۔ بڑے بڑے ثقہ جرنیل آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایسی ایسی مغلظات بکتے ہیں کہ اچھے بھلے پھکڑ شرما جاتے ہیں۔ ایک ہوتے تھے پندرھویں کور کے جنرل آفیسر کمانڈنگ اسکاٹ۔ ہمارے ہاں کے انگریزوں میں عام چرچا رہتا تھا کہ کس طرح انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر اسکاٹوں (اسکاٹ لینڈ کے باشندوں) سے بھر لیا تھا اور کس طرح بچارے جان (ایک انگلستانی) سے کتے کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔

انگریزوں میں طبقاتی منافرت بھی کافی ہے۔ اس کا مجھے پہلی دفعہ احساس 1944ء میں ہوا تھا۔ پلٹن کی بلاوجہ پسپائی کی ایک وجہ یہ خیال کی گئی تھی کہ اس کا باہر کی دنیا سے تعلق نہیں تھا۔ چنانچہ کور ہیڈکوارٹر سے ملاپ رکھنے کیلئے ایک بڑا وائرلیس سیٹ بھیج دیا گیا تھا۔ اسے چلانے والے تین گورے تھے۔ ایک رات کھانے کے بعد میں ان کے پاس سے گزرا تو وہ بی بی سی سے ریڈیو پروگرام سن رہے تھے۔ مسٹر چرچل تقریر کر رہے تھے۔ میں بھی ٹھٹک گیا۔ تقریر ختم ہوئی تو گورے سپاہیوں نے ان کو ایسی بے نقط سنائیں کہ میں حیران و ششدر رہ گیا۔ مسٹر چرچل کے بارے میں جو پروپیگنڈا مجھ تک پہنچا تھا اس سے میں سمجھنے لگا تھا کہ انگریز قوم چرچل کو رحمت کا فرشتہ سمجھتی ہے۔ انگریزوں کے منہ سے ان کی بدخوئی سننا میرے خیال تک میں بھی نہیں تھا۔ 1945ء میں جب انگلستان کے عام انتخابات ہوئے اور مسٹر چرچل شکست کھا گئے تو میں ایسے لوگوں کی اس مختصر تعداد میں تھا جو حیران نہیں ہوئے۔ ہیڈکوارٹر میں میری انگلستان کے ایک بڑے لارڈ کے صاحبزادے سے دوستی ہو گئی۔ یہ صاحب میسولینی کی فوج کے ہاتھ قید ہو گئے تھے۔ لیکن اٹلی کے کمیونسٹوں کی مدد سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے سارا قصہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ آخری حصہ ہیڈکوارٹر کے دوسرے کسی آدمی سے نہ کہوں۔ میرے لئے یہ بھی حیرانگی کی بات تھی کہ انگریز اپنے لوگوں کی نسبت ایک ہندوستانی کو اعتماد میں لے رہا تھا۔

ان کی اس طرح کی کمزوریوں کے باوجود ہمارا ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ وہ یہ کہ انسان کی تہذیبی ارتقا میں وہ ہم سے ایک سیڑھی اوپر تھے۔ وہ سرمایہ داری کے مشینی دور میں تھے اور ہم ابھی تک جاگیرداری کی ہل پنجالی میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہیں سے ان کی قومی و انفرادی تنظیم اور ڈسپلن کی برتری کا جواز نکلتا ہے۔

انگریز قوم نے مشینوں کو ایجاد کیا مگر پھر خود ان کے تابع ہو گئی۔ مشینوں کی وجہ سے تنظیم اور ڈسپلن کی تربیت کا نظام اُسارا۔ ملک بھر ایسی مشینوں سے بھرا پڑا ہے جن میں ایک ہی وقت میں ہزاروں افراد کام کرتے ہیں۔ ان سب کو مل کر مشینوں کو چلانا ہوتا ہے اور اس کی ضروریات پوری کرنا ہوتی ہیں۔ اس میں کسی ایک آدمی کی رائے یا مرضی کو دخل نہیں ہے۔ پھر ان مشینوں اور ان سے متعلقہ کاروبار کے دفتروں میں پہنچنے کے لئے مقررہ وقت پر چلنے والی ریلوں اور بسوں پر سوار ہونا ہوتا ہے۔ چنانچہ صبح سویرے جب کارخانوں کے گھگھو پکارتے ہیں تو پوری کی پوری قوم لبیک کہہ اٹھتی ہے۔ اس طرح شام کے وقت سب اکٹھے ہی گھروں کو لوٹتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں میں وقت کی

پابندی، وعدے پر حاضری، مل کر کام کرنے کی صلاحیت دماغی یا اخلاقی عمل نہیں رہے بلکہ یہ چیزیں ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہیں۔ ان کو پٹھوں کا عمل (Reflex Action) کہا جا سکتا ہے۔

اس ٹریننگ سے بہت دوررس نتیجے نکلتے ہیں۔ جب قوم کا صبح شام یہی عمل ہو تو اس کی گنتی کر لینا، اس کی ضروریات کا اندازہ کر کے راشننگ سسٹم جاری کرنا، ان کو قومی جنگ میں مختلف کام سونپنے سمیت، سکولوں، ہسپتالوں، ریلوں، بسوں کا انتظام معمولی کام رہ جاتے ہیں۔ انگریز فوج کی تنظیم دوسرے قومی شعبوں سے مختلف نہیں ہے۔ چنانچہ لڑائی میں پٹرول، راشن، ذرائع آمد و رفت کی تنظیم بلکہ فوج کے لئے ضروری سامان کی رسد اور اس کے ذخیرے بھی اسی طریقے پر قائم کئے جاتے تھے جس طرح تمام سویلین کمپنیاں اپنے سامان تجارت کی تقسیم کرتی ہیں۔ چنانچہ جنگ شروع ہونے پر کل کے جنرل منیجر آج کے میجر جنرل ہو کر فوج کے کوارٹر ماسٹر بن گئے اور ان کو نئی ذمہ داری سنبھالنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اسی طرح جرنیل ریٹائرڈ ہو کر سیدھے کمپنیوں کے ڈائریکٹر بن جاتے ہیں۔ انگریزوں کے ہاتھ میں قومی تنظیم کا دوسرا حربہ عام انتخابات ہیں۔ چند ہفتوں کے لئے ہر بالغ مرد عورت کو قومی معاملات کے اکھاڑے میں کھینچ لایا جاتا ہے۔ ان کی قومی مسائل میں تعلیم کی جاتی ہے۔ ان کو ورغلایا اکسایا "یا" مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ سب ان مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اس طرح سے اس شور و غوغا کے رنگ میں قومی تنظیم کو بہت سہارا ملتا ہے اور قومی ترقی کی صحت اور رفتار کا تعین ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں سب سے اہم انتظامیہ یونٹ تو ہل، بیل اور ان کو چلانے والا کسان ہے۔ دس ایکڑ کی فارم ہو یا دس ہزار ایکڑ کی زمینداری، اس سے بڑا کاروباری یونٹ نہیں ملتا۔ ایسے میں قوم کے خون میں شیرازہ بندی کا جزو کیسے شامل ہو؟

مشینوں کا عمل سماجی رابطوں پر بھی بہت دوررس ہوتا ہے۔ کارخانہ دار کو اپنے منافع سے غرض ہوتی ہے، مزدوروں کے سلام سے نہیں۔ سلام کا بھوکا بھی ہو تو مزدور اتنے بہت سارے ہوتے ہیں کہ سلام کرتے نہیں۔ اس لئے اسے لاچار منافع پر ہی قناعت کرنا پڑتی ہے۔ کاروبار ایک بہت بڑی الجھن والی چیز ہوتی ہے جس میں طرح طرح کے سودے ہوتے ہیں اور مختلف قسم کی جائیدادوں کا حساب کتاب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے جھگڑے جھمیلے نپٹانے کے لئے ایک واضح قانون اور عدالتوں کے جال کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ مشینی دور کی سرمایہ داری کی ایک خصوصیت مضبوط

اور جامع عدالتی نظام ہوتا ہے۔ لیکن عدالتیں صرف روپے پیسے کے جھگڑے نپٹانے پر اکتفا نہیں کر سکتیں۔ روپے پیسے کے ساتھ انسان بھی لپٹے چلے آتے ہیں۔ یوں ان کے ایک دوسرے کے خلاف ذاتی حقوق بھی تصفیہ طلب امور بن جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سرمایہ داری کی بنیاد ذاتی جائیداد کی تحریم پر ہوتی ہے۔ جائیداد کی تحریم کے ساتھ ذات کی تحریم بھی آ جاتی ہے۔ چنانچہ سوسائٹی میں قانون کی حکومت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ایسے قانون کے ترازو کا پلڑا بری طرح سرمایہ داروں کی طرف جھکا ہوتا ہے اور نہیں تو یہ قانون گراں اتنا ہوتا ہے کہ اس کا پورا فائدہ امیر ہی اٹھا سکتے ہیں۔ پھر بھی جب انسانوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کی حدوں کا تعین ہو جاتا ہے تو ایک طرح کا اطمینان اور دلجمعی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی تعلقات کا رجحان جبر سے ہٹ کر اختیار کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جاگیرداری نظام میں پیداواری نظام کی بجائے ذاتی وفاداری زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لئے قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جاگیردار جس کو چاہے عزت دیتا ہے جسے چاہے ذلیل کرتا ہے۔ اس سے باز پرس نہیں ہو سکتی اس کا مقابلہ بھی کوئی چاہے تو کیوں کر کرے۔ کسان علیحدہ علیحدہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ کام کے سلسلے میں ان کے اکٹھا ہونے کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ جاگیردار چند حواریوں کی مدد سے اکیلے اکیلے کسان کو تابع فرمان رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہزاروں مزدوروں کو مشین اپنی مختلف لیکن متناسب حرکتوں کے ذریعے یوں جوڑ دیتی ہے کہ گویا ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء مل رہے ہیں۔ ان سب کو ملا کر مزدور اتنا بڑا بن جاتا ہے کہ سرمایہ دار کے مالی ذرائع اور حکومت پر اثر ورسوخ کا کچھ نہ کچھ مقابلہ کر سکتا ہے۔ کسی کارخانے میں مزدوروں کے آنے اور وہاں سے نکلنے کا نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کے وقت کمزور انسان اپنی اپنی جھگیوں سے نکل کر ایک ایک کر کے گیٹ میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی کمزوری ان کے چہروں سے عیاں ہوتی ہے۔ شام کو جب کارخانے سے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ایک بہت بڑا اور طاقتور دیو حرکت کر رہا ہے۔

سوسائٹی کے مختلف شعبے اس کے عام چلن کے تابع ہوتے ہیں چنانچہ انگریزی فوج میں نوکری کا بہت لطف تھا۔ سلام پر زور نہیں ہوتا تھا۔ جس کا کام اچھا ہوتا تھا اس کا نام اچھا ہوتا تھا۔ سزا جزا کا سلسلہ اس طرح بنا ہوا تھا کہ ناانصافی کا چانس بہت کم تھا۔ ایک افسر کے خلاف اگر کوئی تعزیری کاروائی کی جاتی تھی تو اس کی اپیل مختلف مدارج طے کر کے گورنر جنرل ان کونسل تک جا سکتی تھی۔ بعض خاص سروس کے افسروں کی پہنچ اس سے بھی اوپر سیکرٹری آف سٹیٹ تک ہوتی تھی۔

افسروں سے نچلے عہدہ داروں کی رسائی کے مدارج بھی ان کے عہدوں کے مطابق تھے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہر انگریز قانون کا متوالا ہوتا ہے۔ ان میں بہت سے ابھی تک جاگیردارانہ ذہنیت میں مبتلا ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ بریگیڈیر اور اس سے اوپر والے افسر عموماً بہت سلجھے ہوئے مزاج کے انگریز ہوتے ہیں۔ انصاف کے مسئلے میں انگریز اور ہندوستانی میں بہت کم تمیز کرتے تھے۔ آخر کچھ بات تو ہے جو اب تک انگریز اتنے ملکوں کو کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) میں لئے بیٹھے ہیں۔

میرا بہت سے انگریزوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔ لیکن معاملہ تلخ کلامی سے آگے نہیں بڑھا۔ بحیثیت مجموعی ان کے ساتھ بیتے ہوئے دن خوشگوار رہے ہیں۔ میری پلٹن تو میرے لئے ایسی رہی ہے جیسے اپنا گھر ہو۔ لیکن تقسیم ملک سے پہلے کے دو سال تو ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا کہ گویا ہم انگریز افسروں کی مہمان داری کر رہے تھے۔ بطور اے ڈی سی (A.D.C) بھی میرا بہت لحاظ رکھا گیا۔ ہیڈ کوارٹر کی تمام فائلوں تک میری رسائی تھی۔ تمام چھوٹے جرنیلوں کی کارکردگی کے بارے میں رپورٹیں، ان کے مجوزہ تبادلے اور تنزلی میری نظروں سے گزرتے تھے۔ جنگ کے تمام رموز و اسرار، آئندہ جنگ کے منصوبے، دشمن کے بارے میں خفیہ رپورٹیں سب تک میری پہنچ تھی۔ کبھی کسی نے میرے اچانک آنے پر گفتگو کا موضوع نہیں بدلا۔ خود جنرل صاحب پدرانہ شفقت سے پیش آتے رہے۔ میں کبھی رنگ کے تعصب (Colour Bar) سے بھی دوچار نہیں ہوا۔ ہیڈ کوارٹر میں تقریباً ہر ہفتے انگلستان سے نرسنگ وغیرہ کے لئے آنے والی لڑکیوں کے اعزاز میں ڈانس ہوتا تھا جس میں میری بھی حاضری لگتی تھی۔ صرف حاضری میں میں ہی ایک ہندوستانی افسر تھا۔ لیکن کبھی کسی نے ناک بھوں نہیں چڑھائی۔ چونکہ میں ڈانس نہیں کرتا تھا اس لئے کئی میم اور صاحب ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔

انگریز مردوں اور عورتوں میں اختلاط کا سلیقہ ہمیشہ میرے لئے جاذبِ نظر رہا ہے۔ اس میں اتنی آسانی، اتنی آسودگی، عورت کے لئے پاس اور لحاظ، اس کی عزت اور خاطر مدارت ہوتی ہے کہ ہم کو اس تک پہنچنے میں ابھی بہت سی منزلیں طے کرنا ہیں۔ اس پر عورتوں کی مردوں کے برابر کی تعلیم، اصابت رائے، خود اعتمادی، ڈر خوف سے آزادی لطف کو دوبالا سہ بالا کر دیتی ہے۔ شروع شروع میں میں ایسے موقعوں سے گریز کرتا تھا کہ جہاں انگریز عورتیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک دفعہ فٹ بال کے مقابلے میں میری کمپنی کی ٹیم جیت گئی۔ کرنل کی بیوی نے انعامات تقسیم کرنے تھے۔ میں

محض اس لئے آنکھ چرا کر ایک طرف ہو گیا کہ مجھے سیلوٹ کرنا تھا۔ میں سیلوٹ اس لئے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں نے سن رکھا تھا کہ خداداد خاں جب وکٹوریا کراس لینے کے لئے ملکۂ معظمہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے سیلوٹ کرنے سے انکار کر دیا کہ آنجناب عورت ذات تھیں۔ اس قصے میں معلوم نہیں کہاں تک صداقت ہے۔ لیکن فوج میں بہت مشہور تھا اور اکثر بیان کیا جاتا تھا۔ معلوم نہیں کہ مجھ پر اس کا اثر کیوں کر ہو گیا حالانکہ ہمارے گھر میں لڑکیوں کا رتبہ لڑکوں سے ہمیشہ بلند رہا ہے۔ خاص کر والد صاحب اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن کسانوں میں گھر کے اندر عورت کی کتنی بھی قدر ہو، اجتماعی معاملات میں ان کا عمل دخل معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر کبھی کوئی عورت پنچائیت کے سامنے یا مردوں کے جمگھٹے میں بات کرتی ہے تو بہت لجا کر اور شرما کر۔ اب جو میں نے دیکھا کہ دوپٹے کا رکھ رکھاؤ تو ایک طرف یہ شے تو سرے سے ہی غائب ہے۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا لباس مختصر ہے اور آنکھ میں آنکھ ڈال کر بے دھڑک گفتگو کرتی ہیں۔

عورت اور مرد ملیں تو مرد کو ٹوپی اٹھا کر سلام یا وردی میں ہو تو سیلوٹ کرنا ہوتا ہے۔ محفل میں جب تک عورتیں بیٹھ نہ جائیں مرد کھڑے رہتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ پیش روی کرتی ہیں۔ نظارہ دلپسند تھا مگر تربیت دیہاتی تھی۔ بہت کوشش میں رہا کہ کسی طرح جنگ میں انگریز عورتوں کا حصہ بھی ہمارے لئے عجائبات روزگار میں سے ہے۔ ایک وقت میں انگلستان کے اندر کپتان اور اس کے نیچے کے تمام عہدے عورتوں کے پاس تھے۔ ایمبولینس گاڑیوں کی ڈرائیور نرسیں، ہوا مار توپوں اور بیلونوں کا انتظام، ٹیلیفون وغیرہ سب عورتوں کے ذمے تھے۔ انگلستان سے باہر بھی ہزاروں انگریز عورتیں لڑائی کے کاموں میں حصہ لے رہی تھیں۔ اس ایک لحاظ سے بھی اپنے ملک کی پسماندگی عیاں ہو جاتی ہے۔ یہ بھی سرمایہ داری دور کا کرشمہ ہے۔ جاگیرداری دور میں عورتوں کی نجات ممکن نہیں ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ انگریز افسر بہت بلبلایا کرتے تھے کہ ہم اپنے ملک سے باہر ہیں اور ہماری عورتوں کو امریکی بدتمیزوں نے سنبھال لیا ہے۔ بعض تو اس حد تک مایوس ہو جاتے تھے اور کہتے تھے کہ سولہ سال سے اوپر کی کوئی انگریز لڑکی شادی کے قابل نہیں رہی۔

یہ واقعہ ہے کہ انگلستان کی رات دن کی بمباری سے پیدا شدہ خطرے کی شدت نے اخلاقی قدروں اور سوشل حد بندیوں کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے۔ لیکن یہ تو جنگ کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ ماڈرن جنگ سے بڑھ کر انسانیت پر کوئی قہر نازل نہیں ہو سکتا۔ اگر انگریز عورتیں اس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیں تو بہت ممکن ہے امریکیوں کے خلاف دوستانہ گلوں شکوں کی بجائے نازی فاتحوں سے

تنگ مخلوق کی آہ و بکا سنائی دیتی۔ میں سمجھتا ہوں انگریز عورتیں جنگ کی کٹھالی سے کندن ہو کر نکلی ہیں۔ اگر ان میں اتنی تعلیم، خود اعتمادی اور تمیز نہ ہوتی تو جو حشر اٹھتا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جاگیرداری ذہنوں میں عورت کا بلند ترین تصور شراب کا ہم مرتبہ ہے۔ دونوں سرور لاتی ہیں۔ اس لئے ان پر جان و دل فدا ہیں۔ تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں۔ شاہد و ساغر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ گو کہیں ساقی مے پر فوقیت لے جاتا ہے کہیں مے ساقی پر۔ لیکن عورت کا تصور بطور انسان جیون ساتھی کے بہت کم ملتا ہے۔ یہ تو اخلاقیات کے ماہر ہی بتا سکتے ہیں کہ ایک ایسا معاشرہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کا حامل ہو سکتا ہے جہاں عورت کو بگڑ جانے والی چیز سمجھا گیا ہے۔ اسے سالہا سال کی قید و بند کے بعد روٹی، کپڑے اور مکان کے عوض عمر بھر کے لئے ایک اجنبی مرد کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ اپنی کھیتی سمجھ کر جیسے چاہے استعمال کرے یا وہ معاشرہ بہتر ہے جس میں عورتوں کو معاشی آزادی کے مواقع حاصل ہیں۔ ان کے لئے ڈاکٹر، پروفیسر، وکیل، جج، ٹیلیفون آپریٹر، مزدور بننے کی راہیں کھلی ہیں۔ وہ اقتصادی طور پر خود کفیل ہو کر اپنی مرضی کا مرد ڈھونڈ سکتی ہیں۔ ظاہر ہے سارا معاشرہ ایک آئیڈیل صورت میں نہیں ہوتا لیکن جب دو معاشروں کا موازنہ کیا جائے تو ان کی انہیں صورتوں کو سامنے رکھا جا سکتا ہے جن کے لئے یہ معاشرے کوشاں ہوں اور جو ان کے لئے دائرہ قدرت سے باہر نہ ہوں۔

فوج میں خاص کر دیسی افسروں کے لئے شادی کا مسئلہ بہت بڑی الجھن ہے۔ ہمارے ملک میں ملازمتوں کے حصول کی بنا پر مردوں کی تعلیم عورتوں کی نسبت بہت آگے نکل گئی ہے۔ افسروں کی عورتوں کو سپاہیوں کی عورتوں اور بچوں کی نگہداشت کرنی ہوتی ہے جس کے لئے ہمارے افسروں کی ان پڑھ بیویاں ناکارہ ہوتی ہیں۔ مرد عورت کی دوستی، کاروبار میں باہمی صلاح مشورے اور دلچسپی، ذہنی اور روحانی یگانگت تو ایک طرف رہی افسر کی بیوی ہونے کی حیثیت میں ان فرائض کی کوتاہی بے چارے کے لئے بہت مشکل پیدا کر دیتی ہے۔

اوپر کی سطروں سے شاید یہ خیال پیدا ہو چلا ہو کہ میں اپنے ملک کے لئے انگریزی طرز کے معاشرے کا خواہشمند ہوں۔ ایسا ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ دن مبارک ہوگا جب ہمارا ملک صنعتی ملکوں کی صف اول میں ہوگا۔ جب یہاں بھی مزدوروں کی کم سے کم مزدوری مقرر ہوگی اور بے روزگاری کے دنوں کے لئے وظیفہ مقرر ہوگا۔ جب لحد سے لیکر مہد تک ہر شخص کے لئے علاج سرکاری خرچ پر ہوگا۔ جب بوڑھوں، اندھوں، اپاہجوں اور دوسرے معذوروں کے لئے

پینشن مقرر ہوگی۔ جب سولہ سال کی عمر تک تعلیم مفت اور لازمی ہوگی۔ لائق بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفے ملیں گے۔ تحریر و تقریر کی آزادی ہوگی تا کہ اختلافات کی برکت سے خیالات شیقل ہوں؟ مجموعی عقل کارفرما ہو اور قوم کی تخلیقی صلاحتیں نشو و نما پا سکیں۔ ساتھ ساتھ میں انگریزی معاشرے کو جوں کا توں اپنے ملک میں لانے کے حق میں نہیں ہوں۔ فی زمانہ قومی ترقی کی کلید صنعتی ترقی میں ہے۔ لیکن صنعتیں قائم کرنے کے لئے انگریزی طرز سے علاوہ بھی طریقے ہیں۔ انگریزوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے ایک پسماندہ قوم کئی صدیوں کی مسافت کے بعد اس مقام پر پہنچ سکتی ہے جہاں انگریز آج ہیں۔ لیکن آج کئی پس ماندہ اقوام نے ایسے نسخے ڈھونڈ لئے ہیں جن سے یہی فاصلہ چند سالوں میں طے ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں زور زیادہ لگتا ہے لیکن آج کے حالات میں صدیوں کا انتظار کون کر سکتا ہے۔

میرا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ سرمایہ داری معاشرے کی تعمیر میں جو خرابی مضمر تھی وہ اب ظاہر ہوگئی ہے۔ اس معاشرے کے گلنے کی سڑانڈ چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ جاگیردارانہ نظام کا نعم البدل ہونے کی حیثیت میں اس کی خوبیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور پچھلے صفحوں میں مَیں اس پر مناسب زور دے چکا ہوں۔ لیکن زمانہ کے تقاضوں نے خود اس کا نعم البدل تیار کر دیا ہے۔ انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ سرمایہ داری نظام میں سے مشینوں کو رکھ لیا جائے اور سرمایہ داری کو ختم کر دیا جائے۔

اس معاشرے کی بنیاد ذاتی منافع ہے۔ ہر کوئی اپنے منافع کی جنگ لڑتا ہے۔ اس لڑائی کو جاری رکھنے کے لئے سرمایہ دار کو آزادی چاہیئے لیکن سوسائٹی میں آزادی غیر منقسم ہوتی ہے۔ اس لئے سرمایہ دار مجبور ہوتا ہے کہ ان طبقوں کو اپنی مدافعت کی آزادی دے جن کو اسے لوٹنا ہے۔ ذاتی منافع کے اصول کی وجہ سے اخلاقی اقدار کی کسوٹی روپیہ ہو جاتا ہے۔ جس کے پاس روپیہ ہے وہ نیک ہے اور اچھی شہرت کا مالک ہے۔ کلبوں، اسمبلیوں، دانش کدوں اور اچھے گھروں کے دروازے اس کے لئے کھلے ہیں۔ جس کے پاس پیسہ نہیں ہے اسے قدم قدم پر ٹوکا جاتا ہے۔ نفسا نفسی کی اس دوڑ میں قوم کی قوم اعصابی اور ذہنی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ازدواجی تعلقات بھی مارکیٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ شادیاں جیون کے سانجھی ساتھی کے لئے نہیں پیسے کے لئے رچائی جاتی ہیں۔ عورت کی عریانی بازار کی جنس کے طور پر بکتی ہے۔ ہر مرد عورت کو کاروں، ریفریجریٹروں، ریڈیو، ٹیلی ویژن سیٹوں اور دوسری استعمال کی اشیاء کے نئے ماڈل خریدنے پر

اکسانے کے لئے اربوں کی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے وہ اپنے لئے بھی صف مقابل کے نئے ماڈلوں کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ظاہری شان و شوکت کی تجلی انسانیت کو اندھیرے میں پھینک دیتی ہے۔ ان باتوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو جنرل لیز کے ہیڈ کوارٹر میں انگریز حکمران خاندان کے صاحبزادوں کی خود غرضی اور نفس پرستی عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ سرمایہ دار کا ''قوم یا قومی مفادات'' کا نعرہ دوسروں کے لئے ہوتا ہے تا کہ لوگ اس کی بنائی ہوئی صنعتی چیزیں خریدیں۔ لیکن اپنی آسائش کے لئے دوسرے ملکوں میں پیسہ صرف کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ جب اپنے نفس کی خدمت میں معاشرے کا نصب العین ہو تو نفس پرستی عیب نہیں لگتا۔ سرمایہ داروں کی نظریں ذاتی منفعت سے اگر کبھی اٹھتی ہیں تو قومی منفعت میں پھنس جاتی ہیں۔ اس لئے ہمارے جیسے پسماندہ ملکوں کو سوائے لوٹ کھسوٹ، سرمایہ دار ملکوں سے کوئی دوسری توقع رکھنی بے سود ہے۔ سرمایہ دار قوم کبھی پسند نہیں کرتی کہ دوسری قوم اس جیسی ہو جائے۔ ایسا ہونے سے روکنے کے لئے دو عظیم جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ تبلیغ جبھی ممکن ہے کہ مبلغ دوسروں کو اپنے جیسا بنانا چاہیے۔ اس لحاظ سے بھی اشتراکیت کو سرمایہ داری پر فوقیت حاصل ہے۔ اشتراکی ممالک ہر کسی کو اپنے جیسا بنانا چاہتے ہیں۔ وہاں کالے گورے دیسی بدیسی ایک ہی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔

سرمایہ داری کو اخلاقی دیوالیہ پن سے زیادہ خطرہ اس چیز سے ہے جس نے اس کو جنم دیا ہے یعنی مشین۔ اب تک تو صرف مزدور کو ہی سرمایہ داری کا گورکن سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اب مشین بھی مزدور کا ساتھ دینے لگی ہے۔ ایٹمی طاقت (Atomic Power) اور خود کار مشینیں ایسی عظیم اختراعات ہیں کہ ان کو افراد کے ہاتھ میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان سے موجودہ معاشرے میں اسی قسم کا ایک دوررس انقلاب آنے والا ہے جو سٹیم انجن کی ایجاد کے بعد جاگیرداری معاشرے میں آیا تھا۔ اُس دور میں جاگیرداری نظام کی حامل قوموں کے سامنے دو راہیں رہ گئی تھیں۔ یا تو جاگیردارانہ، معاشرتی رشتے قائم رکھیں اور اس کی سزا کے طور پر سرمایہ داری نظام پر عامل قوموں کے تابع ہو جائیں یا پھر سرمایہ داری قبول کر لیں۔ ایٹمی طاقت اور آٹومیٹک مشینیں پیداوار میں ایسا سیلاب لانے والی ہیں جس سے منڈی کا تصور اور اسٹاک ایکسچینج بہہ جائیں گے اور قوموں کے سامنے دو راہیں رہ جائیں گی۔ اس نظام کو اپنا لیں یا اس نظام پر عامل قوموں کے طابع ہو جائیں۔

ترقی یافتہ سرمایہ دار قوموں کے لئے یہ مسئلہ اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے لئے ہے۔ انہوں نے جبری بھرتی Conscription کے ذریعے انسانی اشتراک کا اصول تو مدتیں ہوئی مان لیا ہے ذرائع

پیداوار اور دولت کا تو میانہ باقی رہ گیا ہے۔ اس میں ذاتی جائیداد اگرچہ انسانوں کی نسبت زیادہ متبرک خیال کی جاتی ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں دولت پیدا کرنے کا سارا انتظام سرمایہ دار کے ہاتھوں سے نکل کر اہل کاروں کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ منافع کی تقسیم چند افراد تک محدود رکھنے کی بجائے قوم بھر کے حوالے کر دی جائے تو اشتراکیت آ جائے گی۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ اجارہ داری کی منزل پر پہنچ کر سرمایہ داری میں اشتراکیت کی اتنی خصوصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ بس اسے سر کے بل کھڑا کر دو تو اشتراکیت بن جائے گی۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو کئی صفحوں پر پھیل گیا ہے۔ انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانی افسروں کو جو مشکلات پیش آ رہی تھیں ان کا تفصیل سے ذکر میں پہلے کسی مقام پر کر چکا ہوں۔ اب ہمارے لئے دو ہی راستے کھلے تھے۔ یا تو صاحب بن جائیں اور اپنے ہی لوگوں کے ساتھ ''ہم کی تم کی'' کریں یا دیسی بنے رہیں اور حسن اخلاق و کارکردگی سے ماتحتوں میں اپنا وقار قائم کریں۔ دوسرا طریقہ کٹھن تھا۔ اس لئے کہ جہاں معاملہ گھر کا جوگی جوگنا اور باہر کا جوگی سدھ والا ہو وہاں آدمی باہر کے جوگی کا بہروپ دھارے تو بہت ہی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کئی ہندوستانی افسروں نے ایسا کیا۔ میں بھی شاید ایسا ہی کرتا لیکن میرے لئے مشکل تھی کہ صرف باہر کا بہروپ کافی نہیں تھا جبکہ اندر بدلنا بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ مجھ میں اور سپاہیوں میں کچھ فرق بھی تو نہیں تھا۔ ان میں کئی مجھے باپ کی جگہ نظر آتے تھے اور کئی چچوں جیسے اور کئی بھائیوں جیسے، اپنے ہی گھر والوں سے کیسے بھاگ جاتا۔

ان حالات سے نمٹنے کے لئے میں نے یہ وطیرہ اختیار کیا تھا کہ ڈیوٹی پر افسری کرتا تھا اور ڈیوٹی کے باہر بھائی چارا۔ چنانچہ 1947 میں جب مجھے کوئی چھ ماہ کے لئے پلٹن کی کمان سنبھالنے کا موقع ملا تو انگریز جا چکے تھے۔ دیسی افسروں میں ہندو مسلمان سکھ سب شامل تھے۔ حال یہ تھا کہ جب مَیں دفتر میں ہوتا تھا تو سامنے سے نہیں گزرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اس وقت انتہائی کمینگی پر اتر آتا ہوں۔ لیکن اس کا بدلہ شام کو آفیسر میس میں نکالتے تھے اور صبح کے وقت میرے اردلی کو کوٹ، کالر، ٹائی کی مرمت کے لئے درزی کے پاس بھاگنا پڑتا تھا۔ جسم پر خراشیں اس کے علاوہ ہوتی تھیں۔

باب نمبر 9

شترغمزے

ایک خدا کے ماننے والے بت پرستوں کو برا کہتے ہیں۔ بت پرست مسلمانوں کو ملیچھ سمجھتے ہیں۔ گوروں میں کالا رنگ نحوست کی نشانی ہے اور افریقہ کے حبشیوں میں سفید رنگ بیماری کی علامت ہے۔ عرب کے بدوؤں کے لئے بہشت وہ ہے جہاں ٹھنڈے پانی کے چشمے ہوں۔ اسکیمو کی نظر میں بہشت وہ ہے جہاں گرم پانی زمین سے اُبل رہا ہو۔ صوفی مولوی کو ظاہر پرست کہتا ہے مولوی صوفی کو بدعتی .... سب اپنی اپنی پسند ہے۔

امیر غریب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور غریب امیر کو کن نظروں سے دیکھتا ہے؟ کبھی حسد، کبھی عاجزی، کبھی خوف، کبھی اطاعت، کبھی محبت، کبھی نفرت کی نظروں سے لیکن حقارت؟ کبھی نہیں۔ اس لئے کہ ایسا کوئی غریب نہیں ہے جو ان نعمتوں سے بہرہ مند نہیں ہونا چاہتا جو امیری کے لوازمات ہیں۔ اگر کسان گندم کے دانے کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتا ہے تو کیک، پیسٹری، ڈبل روٹی، نان، پراٹھا، مٹھائی کو کیوں برا کہے گا۔ لیکن کتنے کسانوں کا دسترخواں ان سے سجتا ہے؟ سنار بیٹھے بیٹھے آنکھ سے بینائی اور ٹانگوں کی سکت کھو دیتا ہے تاکہ کوئی شہزادی سنگھار کر سکے۔ اس کی اپنی بیوی، بیٹی، بہو کی آرزوئیں زیور کے ساتھ ڈبے میں بند ہو جاتی ہیں۔ معمار بڑے بڑے محلات، کلبیں، ہوٹل، قہوہ خانے بناتا ہے لیکن ان کی تکمیل پر ان کے اندر اس کا گزر ممکن نہیں۔ وہ اپنی جھونپڑی میں برسات کی ساری رات سامان اِدھر اُدھر کرنے میں گزار دیتا ہے۔ زربفت اور کمخواب بنانے والے خود پھٹے حالوں رہتے ہیں۔ گویے ساری عمر کی ریاضت اس لئے کرتے ہیں کہ کوئی استطاعت والا اُن کے فن کی داد دے سکے۔ مصور تصویریں اس لئے بناتا ہے کہ کوئی پیسے والا خرید لے۔ شاعر کی ایک بغل میں تلمیذ الرحمٰن کی سند ہوتی ہے تو دوسری میں کشکول۔ وہ اس

تاک میں رہتا ہے کہ کب کوئی اہل ثروت اسے اپنی محفل کی سجاوٹ بنائے۔ ان لوگوں کو جب اپنے فن اپنی تخلیق سے محبت ہے تو ان کی تحقیر کیسے کریں جن کی خوشنودی کے لئے خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئی جاتی رہی ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں میں سے ایک آدھ غریبی کی حد پار کر جاتا ہے لیکن اپنی عادتیں قائم رکھتا ہے۔ نادر شاہ ابن شمشیر ابن شمشیر ہفتاد بارمی گویند کے بارے میں تو مشہور ہے ہی کہ حلوہ سمجھ کر گلقند کے دو چار مرتبان چٹ کر گیا۔ ہر کوئی بالملاحظہ ہوشیار رہا۔ لیکن وہ نادر شاہ تھا۔ اس کی شمشیر بہت آب دار تھی اور طاقت کی روایت مسلمہ ہے۔ لیکن ہر کوئی نادر شاہ نہیں ہوتا اور نو دولتیے تو دولتیاں جھاڑتے اور کلیلیں کرتے ہیں۔ بے وقت کی راگنی گاتے ہیں۔ ظاہری نمود پر جان دیتے ہیں اور لوگوں کی نظروں میں جچنے کے لئے زندگی بے مزہ کر لیتے ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا۔

میں کئی سال انکھیوں سے لوگوں کو چھری کانٹا چلاتے دیکھتا رہا۔ آدابِ محفل میں کوتاہی سے بچنے کے لئے کسی امام کا اس کو اطلاع کئے بغیر سہارا لیتا رہا۔ بہت دفعہ جب کسی بیرے نے کوئی غلطی پکڑ لی تو اس کی تالیفِ قلب کے لئے دُگنی بخشش دی۔ کئی دفعہ گاؤں کے گنوار بھائی بند آ نکلے تو زمین کے پھٹ جانے کے لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ وہ وفورِ محبت سے باغ باغ ہو جاتے تھے اور ہمارے چہرے کا رنگ یوں اڑ جاتا تھا گویا برسوں سے بیمار ہیں۔ تانگے میں اکیلے بیٹھ کر خوشحالی محسوس کرنے کی بجائے ہمیشہ شرمندہ سا رہا۔ ریل کی بجائے بس کو ترجیح دی تاکہ فسٹ کلاس کے کرائے سے جان چھوٹے۔ گھر والوں کے ساتھ ہمسفری سے اجتناب کیا اس لئے کہ اپنے لئے فسٹ کلاس سے کم کی اجازت نہیں تھی۔ سب کے لئے فسٹ کلاس کا یارا نہیں تھا اور ان کو ”سرونٹ“ میں ڈالنے سے دل انکاری تھا۔ کبھی دل کھول کر پیسہ خرچ کرنے سے لطف نہیں اٹھایا۔ بس ایسے محسوس کیا کہ جلتے ہوئے مکان سے چھلانگ لگا رہا ہوں۔

جنگ کے دنوں میں زندگی کے معاملات اتنے الجھے ہوئے نہیں تھے۔ جب ایک محاذ پر ہزیمت ہوتی تھی تو آدمی کسی دوسرے محاذ پر کوشش کر کے کامیابی حاصل کر سکتا تھا۔ ہر کام کے دام تھے۔ لیکن جب امن کی برکتیں نازل ہونے لگیں اور چاروں طرف بیش بہا قالین، پردے، صوفہ سیٹ، جیولری، کراکری، کٹلری، کاریں، ساڑھیاں چمکنے دمکنے لگیں، تو بڑے بڑے رستموں کے پتے پانی ہو گئے۔ کئی خیانت کے جرم میں نکالے گئے۔ بعض دوسروں نے مناسب بیگمات ڈھونڈ لیں اور یوں بن باس لے لیا۔ باقیوں نے بڑے بڑے پتھر سینوں پر رکھ لئے اور شراب نوشی سے غم غلط کرنے لگے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ”پیسہ مشکل کشا“ ہے۔ آدابِ محفل کے سکول کھلے ہیں۔ امیروں کے بچوں کی درسگاہیں ہیں جہاں سے وہ جب تربیت پا کر نکلتے ہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کسی زمانے میں والد ماجد نے پان بیڑی کی دکان کر رکھی تھی یا ہل کی ہتھی پر ہاتھ دھرے خاک روندتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ انسانیت کی آزادی کی طرف پرواز کی نشانی ہے۔ عزت و شرافت کا نشان ایک ایسی چیز یعنی پیسہ مقرر کی گئی ہے جو بذاتِ خود کسی قسم کی نجابت سے پاک ہے۔ اس کے سوئمبر میں ہر کوئی شامل ہو سکتا ہے۔ انسانیت کی آزادی کی اگلی منزل وہ ہے جب پیسہ بھی امتیاز کی کسوٹی نہیں رہتا۔ اشیاء کی افراط اور ان کی منصفانہ تقسیم پیسے کی اہمیت ختم کر دیتی ہیں۔ انسانوں میں بڑا وہ رہ جاتا ہے جو انسانیت میں بڑا ہو۔ ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔ منو مہاراج نے ابد تک کے لئے شریفوں اور رذیلوں کا خاندانی سلسلہ جاری کر دیا ہے۔ ایران میں مزدک نے مساوات کا علم بلند کیا تھا تو نوشیروان نے لاکھوں مزدکیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ شہنشاہیت کے خوشہ چینوں نے نوشیروان کو ابدا لآباد تک عادل کا خطاب بخش دیا۔ مزدک کو مردود، زندیق اور کئی دوسرے خطابات سے نوازا۔

علم و فضل کے قدر دان چونکہ سرکاری درباری آدمی ہوتے تھے اس لئے انہوں نے اسی قسم کے لٹریچر کو فروغ دیا جس میں نوشیروان کی فضیلت اور مزدک کی رذالت ثابت ہوتی ہے۔ آج غریبوں کے بچے بھی ایسی ہی باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ پاک ہستیوں نے تو اپنی ساری عمر چیتھڑوں میں بسر کی، ”جو“ کی روٹی پر قناعت کی، اپنی فقیری کو غنا میں بدل کر اس پر فخر کیا، جبر و استبداد کے خلاف جہاد کیا۔ رنگ اور نسل کی پابندیوں کو گناہ قرار دیا اور علم و عمل کو فضیلت کی کسوٹی مقرر کیا۔ ان کو بڑے بڑے خطابات دے کر غریبوں سے چھین لیا گیا۔ بادشاہوں نے ان کی قبروں کو اپنے ایوانوں کی شکل دے کر انسانیت کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ آج بھی افریقہ میں انسانوں کو ریلوں، بسوں، سکولوں ہوٹلوں، قہوہ خانوں، شہروں، قصبوں میں اس لئے جگہ نہیں دی جاتی کہ ان کا رنگ کالا ہے۔

تاریخ میں دکھیارے انسانوں کے کتنے خواب پریشاں ہوئے ہیں۔ سپارٹیکس نے غلامی سے نجات پانے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ لیکن بے شمار قربانیوں کے بعد صرف اتنا ہوا کہ غلاموں کو مزارعوں میں بدل دیا گیا اور آقا بڑے بڑے زمیندار بن گئے۔ صدیاں اس حالت میں گزر گئیں۔ جگہ جگہ انسانیت کے متوالوں نے بولہبوں اور بوجہلوں کے خلاف جہاد کیا لیکن دلوں میں ایک جلن اور امید کا مدھم سا دیا چھوڑنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ اٹھارویں صدی میں پیرس کی

گلیاں ''آزادی، مساوات اور اخوت'' کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ لیکن جب ہجوم کا جوش ٹھنڈا پڑا اور انقلاب کی گرد کم ہوئی تو دیکھا گیا کہ امیر اب بھی امیر ہیں اور غریب اب بھی غریب۔ محض چولے بدل لئے ہیں۔ پہلے جو جاگیر دار تھا اب سرمایہ دار بن گیا اور مزارع کو مزدوری پر لگا دیا گیا۔ لیکن یہاں سے تاریخ کا دھارا مڑنے لگا اور انسانی تاریخ میں پہلی بار مزدور کی صورت میں غریب نے سر اٹھایا۔ امیر کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور وقت آنے پر دنیا کے ایک حصے سے اس جنس کو نایاب کر دیا۔

اب یہ حالت ہے کہ ملکوں کی سیاحت صرف امیروں اور درویشوں کا حصہ نہیں رہا۔ مزدوروں اور کسانوں کے وفود بھی ملک ملک کی سیر کر رہے ہیں۔ بیلٹ آرٹ کی نمائش میں صرف زرق برق لباس والوں کا داخلہ نہیں ہے۔ محنت کش بھی مخمل و کمخواب کی سیٹوں میں بیٹھ کر انسانی صناعی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ علم و فضل آکسفورڈ اور کیمبرج تک ہی محدود نہیں رہا۔ مزدوروں کی درسگاہیں جہالت کے اندھیرے میں علم و عمل کے چاند تارے اڑا رہی ہیں۔ آداب محفل میں، ادب و موسیقی، مصوری و نقش گری کے رموز و اسرار کی سمجھ بوجھ میں مزدور بچے کسی سے کم نہیں ہیں۔ لیکن یہ خوشگوار تبدیلی ہر جگہ نہیں آئی۔ ہماری سوسائٹی میں جو بچہ ڈرائنگ روم، کنڈر گارڈن اور کانونٹ وغیرہ کی راہ سے اوپر نہیں آتا، مہذب سوسائٹی میں، رکھ رکھاؤ میں اس کی جولانیاں شتر غمزوں کی قسم کی صفائی اور شستگی لئے ہوتی ہیں۔

مرّ ور زمانہ (بدلتے وقت) نے عزت اور ذلت کی قدریں کیسے بدل دی ہیں۔ اس کا اندازہ چین کے ساٹھ کروڑ عوام کی حکمران جماعت کی رکن سازی کے اصول و قواعد سے ہو جائے گا۔ پارٹی کا دستور عمر کی شرط لگانے کے علاوہ ان لوگوں کو جو ممبر بننا چاہتے ہیں چار حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ تقسیم ان لوگوں کی سوسائٹی میں حیثیت کے مطابق ہے اور منو مہاراج کی تقسیم کا بالکل الٹ بھی۔

سب سے مقدم جو لوگ آتے ہیں وہ ہیں کارخانہ کے مزدور، البتہ کبھی کبھار مزدوری کرنے والے لوگ، کھیت مزدور، غریب کاشتکار، شہر کے غریب باشندے اور انقلابی سپاہی بھی اس فہرست میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی ممبری کے لئے سفارش کرنے والوں کے لئے اونچی صفات کا مالک ہونا ضروری نہیں ہے اور ان کو زیر نگرانی بھی زیادہ دیر نہیں رکھا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پارٹی ممبری کے لئے پرولتاری اور نیم پرولتاری عوام پر کوئی خاص پابندی عائد نہیں ہے۔

دوسری جگہ پر وہ لوگ آتے ہیں جو نچلے متوسط طبقے کے انقلابی ہیں۔ ان کی سفارش کرنے والے

ممبروں کے لئے زیادہ تجربہ کار ہونا ضروری ہے۔ ان کی نگرانی کے لئے ایک سال کا عرصہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اس طبقہ کے لوگوں کے خیالات عموماً الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ پارٹی کے ڈسپلن سے بھی گھبراتے ہیں اور انقلابی جدو جہد میں شامل ہونے سے بھی گھبراتے ہیں.........

تیسری قسم ان انقلاب پسندوں کی ہے جو درمیانے اور اونچے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ممبری کی شرائط زیادہ کڑی ہیں۔ کیونکہ ان کے خیالات میں نچلے درمیانہ طبقے سے بھی زیادہ الجھن ہوتی ہے۔ یہ پارٹی کا پروگرام اور ڈسپلن ماننے میں بہت تکلیف محسوس کرتے ہی۔ ان کو دو سال تک زیر نگرانی رہنا پڑتا ہے.........

چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو پہلے دوسری سیاسی جماعتوں کے ممبر رہ چکے ہوں۔ ان کے لئے ممبری کی شرائط بہت کڑی ہیں۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے لئے حکمران جماعت میں کوئی جگہ نہیں یعنی جتنا کوئی زیادہ غریب ہے حکمران جماعت کی ممبری کے لئے اس کا رتبہ اتنا ہی بلند ہے۔ اب تک تو دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے کہ پیسے والے کے لئے سب دروازے کھلے تھے۔ غریب اپنی جھونپڑی میں بھی محفوظ نہیں تھا اور اب پیسہ گلے طوق بن گیا ہے۔ برا ہو یا بھلا ہے تو یہ انقلاب۔ ہزاروں سالوں کی اقتصادی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی قدریں الٹا دی گئی ہی۔ تاریخ کا نیا باب کھل گیا ہے۔

1953ء میں میرا منٹگمری جیل میں قیام تھا۔ قید ہوئے دو سال ہو گئے تھے لیکن یہ عرصہ مقدمے کی گہما گہمی میں گزر گیا تھا۔ بیم و رجا کی کشاکش نے زندگی کے سیاق و سباق پر سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اب سزا ہو چکی تھی۔ رہائی کی تاریخ کا کم و بیش اندازہ ہو گیا تھا، اس لئے قدرے اطمینان تھا۔ اکثر راتوں کو لیٹے لیٹے گذری ہوئی عمر کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔

جیل کی صبح شام باہر کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سرکاری اہلکاروں کی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے قیدیوں کو باہر کے واقعات سے الگ تھلگ رکھا جائے۔ ہمیں چونکہ خطرناک سمجھا جاتا تھا اس لئے ہماری دنیا جیل کی دنیا سے بھی علیحدہ تھی۔ اس طرح ہم دہرے پردے میں رہتے تھے۔ باہر کی خبریں چھن چھن کر آتیں تھیں اور ان کی زیادہ تر تازگی اور دلچسپی باسی ہو جاتی تھی۔ دل بہت جلتا تھا لیکن کیا ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی عادت ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ خیالات حال اور مستقبل سے سے ہٹ کر ماضی کی طرف گھومتے گئے۔

ایک طرف ہٹ کر دیکھنے سے مجھے اپنی گذشتہ زندگی میں جو بات سب سے نمایاں نظر آتی وہ میری

جدوجہد تھی جو دس گیارہ سال سے حکمران طبقے میں داخلہ پانے کے بعد مَیں نے قبول عام کے لئے کی تھی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہزاروں سالوں سے انسان طرح طرح کے طبقوں میں بٹا ہے۔ سب سے پہلی قسم تو جغرافیائی تقسیم ہے۔ جنگلوں، پہاڑوں، ریگستانوں، دریاؤں، سمندروں نے لاکھوں سالوں سے انسانی آمدورفت کو محدود کر رکھا ہے۔ اس وجہ سے انسانیت کے بہت سے طبقے الگ تھلگ تہذیبی اور تمدنی راستے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ بعد میں ان طبقوں کو قوم کا نام دیا گیا اور جس علاقے میں یہ قوم آباد تھی اس کو ملک کا خطاب ملا۔ اب مختلف قوموں کی مختلف زبانیں ہیں۔ عقیدے اور رسمیں اپنی اپنی ہیں۔ ایک قوم کا فرد دوسری قوم میں جا نکلتا ہے تو اجنبی کہلاتا ہے۔ آب و ہوا نے مختلف قوموں کے رنگ روپ، زبان، لباس، غذا، رہائش اور روزی کمانے کے ذریعوں میں بھی امتیاز پیدا کر دیا ہے۔

اس طرح سے قوموں کی آپس کی اجنبیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ جنگ و جدل نے اس میں فخر و مباہات اور نفرت و حقارت کے جذبات شامل کر دیئے ہیں۔ قوموں کے اندر پیشہ وارانہ تقسیم ہے۔ ہر پیشہ والوں کے اپنے آلات اور اوزار ہوتے ہیں جن کو وہ ایک خاص ڈھنگ سے استعمال کرتے ہیں۔ کاریگری کے اسرار و رموز ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ایک پیشہ کا آدمی دوسرے پیشے والوں میں اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مختلف مذہبوں نے عبادات کے طریقوں، حلال و حرام میں اختلاف اور دیگر سماجی و معاشرتی حد بندیوں کے ذریعے انسانی تقسیم میں حد درجہ اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مذہب میں مختلف فرقے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کا نیم براعظم اس لئے باقی دنیا سے نیارا ہے کہ یہاں جات پات کی تقسیم باقی سب انسانوں تقسیموں کو مات کر دیتی ہے اور معاملہ آپس میں چھوت چھات تک پہنچا دیا گیا ہے حتیٰ کہ بعض انسانوں کا سایہ تک دوسرے انسانوں کے لئے منحوس اور ناپاک خیال کیا جاتا ہے۔

کالج میں ایک چمار لڑکا میرا ہم جماعت اور دوست تھا۔ ایک دن مجھے ملنے آیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میں اپنے کمرے سے کچھ دور درختوں کے سائے میں بیٹھا پڑھائی میں مشغول تھا۔ وہ سیدھا میرے کمرے میں آیا۔ مَیں نے دیکھ کر آواز دی اور کہا "یار آتے ہوئے میرے لئے پانی کا ایک گلاس لیتے آنا"۔ وہ بہت سٹپٹایا۔ دیر تک بغلیں جھانکتا رہا۔ آخر کار لپک کر انجیر کے درخت سے ایک پتہ توڑا اور اس میں گلاس کو لپیٹ کر میرے لیے پانی کا گلاس لے آیا۔ مجھے بہت حیرت اور پریشانی ہوئی کہ ایک صاف ستھرا خوش پوش صحتمند نوجوان اپنے آپ کو اتنا غلیظ سمجھتا ہے۔ بہت

رد و کد کے بعد وہ اس پر تیار ہوا کہ انجیر کا پتہ پھینک کر خالی ہاتھ سے گلاس پکڑ کر مجھے دے۔ مجھے پہلی دفعہ شودروں کی بدقسمتی کا پورا اندازہ ہوا کہ کس طرح ان کا احساس کمتری ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ کیونکہ وہ ہزاروں سالوں سے سوسائٹی کے غلیظ ترین کام بلا حیل و حجت انجام دیتے آ رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں براہمن ہیں کہ کانگریس ہو یا کمیونسٹ پارٹی، شمالی ہندوستان ہو یا دکن، بنگال ہو یا مہاراشٹر سب جگہ پردھان بنے بیٹھے ہیں۔ اگر کسی جگہ براہمن نہیں ہیں تو دوسری اونچی جاتیوں کے لوگ ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ان کا ہر بچہ پیدا ہوتے ہی دنیا کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ دوسری طرف شودر ہیں کہ ان کا رتبہ گائے اور بندر سے بھی کم ہے۔ ان کے بچوں کے لئے زندگی کی دوڑ میں سب سے بڑی رکاوٹ یعنی Handicap تو یہی رویہ ہے!

خود مجھے اپنے چمار دوست کی سی الجھنوں سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ ہمارے دیہات میں اونچی ذات اس کی ہے جس کے پاس زمین ہے۔ اس لئے کہ زمین ہی ایک ذریعہ معاش ہے اور زمین والے سے ہر کسی کو غرض ہوتی ہے۔ گاؤں میں سیّد ہو یا براہمن، مغل ہو یا پٹھان اگر اس کے پاس زمین نہیں ہے تو نیچ ذاتوں میں نہیں تو اونچی ذاتوں میں بھی شمار نہیں ہوتا۔ انگریزوں نے بھی پنجاب کے بعض قبائل میں فوج کی بھرتی اور زرعی زمین کی خرید و فروخت محدود کر کے ان کو باقی لوگوں سے برتری کا درجہ بخش دیا ہے۔ اس لحاظ سے میں نسبی کمتری کا کبھی بھی شکار نہیں ہوا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ کبھی کبھی برتری کے آثار نمایاں ہو گئے ہوں۔ لیکن ایک گاؤں کی اونچ نیچ کا معیار ہی کیا ہوتا ہے۔ وہاں تو سب سے اونچی ذات پٹواری، تھانیدار اور تحصیلدار کی ہوتی ہے۔ ان سے اوپر کے لوگ تو بس دیوتا ہوتے ہیں۔ ایک دیہاتی کا ذہنی اور معاشرتی حلیہ اس وقت بگڑتا ہے جب وہ ان دیوتاؤں کی سرزمین میں قدم دھرتا ہے۔

اسی قسم کے خیالات تھے جو جیل کی تنہا راتوں میں بار بار ابھرتے تھے اور الجھ جاتے تھے۔ چنانچہ سلجھانے کے لئے میں نے ان کو لکھنا شروع کر دیا اور رہائی کے وقت تک شروع کے چند باب لکھ چکا تھا۔ آزادی کے بعد غم دوراں میں مبتلا ہو گیا اور جیل کی تحریریں کسی کونے کھدرے میں گر گئیں اور اب ان کی ترتیب کی نوبت آئی ہے۔

یہ داستان 1942ء میں شروع ہوتی ہے اور یہ 1946ء کے لگ بھگ ختم ہو جاتی ہے۔ کہیں کہیں پس منظر آ گیا ہے۔ اس کے بعد بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں جن کا میری زندگی پر گہرا اثر ہوا ہے۔ تحریک پاکستان، نیم براعظم کی آزادی، تقسیم ہند کے وقت ہونے والے خوفناک

فسادات، برٹش انڈین فوج کی تقسیم، کشمیر کی جنگ، راولپنڈی سازش کیس میں معتوبی اور سزا، جیل کے چار سال، رہائی کے بعد ملک کی سیاست سے دلچسپی اور سیاسی لیڈروں سے رابطہ، سیاسی ہنگامے، ان سب کا اس لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ میرا منشاء اپنی سوانح عمری لکھنا نہیں ہے۔ میں تو ایک کسان کے بیٹے کی داستان لکھ رہا ہوں جو انگریز کی فوج میں افسر بن گیا تھا۔ مبتدی کے لئے اپنے تجربات اور احساسات دوسروں کے رنگ میں پیش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ایک مصنف کی پہلی کتاب جس ڈھب کی بھی ہو زیادہ تر ذاتی معاملات کی عکاس ہوتی ہے۔ اس لئے سوانح عمری سے کسی طور مفر نہیں ہے۔ ان تین چار سال میں دہقانی طبیعت نے جہاں مختلف حالات میں جولانیاں دکھلائی ہیں وہاں زمانے کا رندہ بھی اس کے بے ڈھب کونے برابر کرتا رہا ہے حتیٰ کہ 1946ء تک میرے اندر کا کسان بہت حد تک گھس پٹ چکا تھا۔

پہلی نظر کا تیر محبت کی لہر لا سکتا ہے تو نفرت کی زہر میں بھی بجھا ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر پڑھنے والے کے دل میں ان جذبات کی کم و بیش شدت اس کے اپنے موڈ پر منحصر ہے۔ یہ اس کی دین ہوتی ہے۔ اس لئے اظہار تشکر یا معذرت بے معنی ہیں۔ کچھ عزیزوں کو البتہ پہلے تین بابوں پر اعتراض ہے کہ ان کی وجہ سے بالواسطہ ان کی بھی تحقیر ہو گئی۔ ان سے واقعی وضعداری اور رکھ رکھاؤ میں رخنے پڑ جانے کا احتمال ہے اس لئے میں ان سے معذرت چاہتا ہوں۔ اگرچہ آج کے زمانے کے مطابق دیکھا جائے تو اس میں کچھ ایسی بے توقیری بھی نہیں ہے۔ دنیا کے بہت بڑے حصے میں عزت و نخوت کے القاب اور نشان مثلاً سفید فام، بادشاہ، راجہ، نواب، لارڈ، لیڈی، امیر، شیخ، براہمن، سید، پنڈت، لامہ، خانزادہ، چوہدری وغیرہ پرانے وقتوں کے کھنڈروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور انسانوں کی نئی پود کے ذہن ان تصورات سے آلودہ نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کے ہاتھوں ان لوگوں کو جو شخصی دولت کی بنا پر دوسرے انسانوں کا استحصال کرتے ہیں چوروں اور ڈاکوؤں کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ باقی دنیا میں اب بھی دولت انسانی خوبیوں کی کسوٹی ہے لیکن کم۔ اس وقت افریقہ اور ایشیاء میں انسانیت کا جو بے پناہ طوفان اٹھ رہا ہے اس سے حیوانی نسل اور دولت و ثروت کی برتری بہت حد تک ختم ہو جائے گی۔ انسانی خوبیاں اپنی جبلی آب و تاب سے جگمگانے لگیں گی۔

بعض دوستوں سے اس لئے معذرت چاہتا ہوں کہ اُن کا بنا پوچھے نام لے گیا ہوں اور بعض سے اس لئے کہ ان کا نام نہیں لے سکا۔ بہت سے ایسے واقعات ہیں جن کے لکھنے کو جی تو بہت چاہتا تھا

لیکن چھوڑ گیا ہوں۔ اس لئے کہ کچھ دوستوں کی امداد کی ضرورت تھی اور ان کے ساتھ راہ و رسم پر تعزیریں ہیں۔

بعض قلبی وارداتیں بیان کرنے میں بھی مصلحت آڑے آ گئی ہے۔ ان کے لئے یا تو منصور کا دل گردہ ہو یا پھر پیرس ہو اور آندرے ژید ہو۔ انسان کو حیوانِ ناطق بھی کہتے ہیں۔ ''نطق'' میں زبان ہی نہیں انسانی جذبوں، احساسوں اور کیفیتوں کے اظہار کے دوسرے ذریعوں مثلاً مصوری، سنگ ریزی، موسیقی، رقص وغیرہ کو بھی شامل سمجھا جاتا ہے اور سائنس کی مختلف شاخوں ریاضی، علم طب، فزکس، کیمسٹری وغیرہ اور انسانی شخصیت کے بارے میں علوم مثلاً سائیکالوجی وغیرہ سب مل کر انسان کو حیوان سے ممتاز کرتے ہیں۔ ایشیاء اور افریقہ میں اس لحاظ سے انسانیت بہت پسماندہ ہے اور مغربی استعمار ختم ہو جانے پر بھی دیر تک مغرب کی مرہونِ منت رہے گی۔ ہمیں مدتوں مغربی ملکوں میں بسنے والی انسانی برادری کی شاگردی میں رہنا ہو گا۔

ابھی اپنے دیس کی اُداس فضا میں ممکن نہیں ہے کہ خیالات کی بوقلمی ہو اور مشاہدہ و مجاہدہ کے باغ و بہار کھلیں۔ یہاں تو ہر کوئی دنیا کے ہاتھوں تنگ، آنے والی مصیبت کے انتظار میں ہے۔ زندگی کی خوشیاں اور اس کے پیار کمھلا گئے ہیں۔ ایسے میں میرے جیسا ایک عام انسان کس برتے پر ''شرعی حدیں توڑے''۔ حسین علیہ اسلام، غزالی یا ابنِ سینا بننے کے لئے صرف جنون ہی کافی نہیں غیر معمولی اہلیت بھی چاہیئے۔

O

دست بے چارگاں یار محنت کشاں
میجر اسحاق تھا زندگی کا فشاں
اس نے مزدور کا دل بڑھایا سدا
اس نے گونگے کسانوں کو بخشی زباں
مرتے دم تک وہ لڑتا رہا ظلم سے
اس کے لب پہ رہی امن کی داستاں
وہ جلاتا رہا آندھیوں میں دیئے
وہ زمیں کو بناتا رہا آسماں
چاک کرتا رہا وہ گریبانِ شب
وہ مٹاتا رہا ظلمتوں کے نشاں
کون دشمن ہے اس نے بتایا ہمیں
اس نے رہزن کا چہرہ دکھایا ہمیں
اس کی باتیں سنیں اس کے ہم ہو گئے
اس نے حق بات کرنا سکھایا ہمیں
لکھ رہے ہیں جو ہم، پڑھ رہے ہیں جو ہم

سب اسی نے سکھایا پڑھایا ہمیں
چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہے زندگی
اس نے جاں سے گزر کر بتایا ہمیں
اس نے ہم کو دیا منزلوں کا نشاں
اس نے خوابیدگی سے جگایا ہمیں!
گیت سچائی کا حسن و رعنائی کا
برسر دار اس نے سنایا ہمیں
جبر ابہام کا ہو کہ اوہام ہو
اس نے ہر جبریت سے چھڑایا ہمیں
حبیب جالب

میجر اسحاق محمد کے نام

لفظوں کی دھنک، علم کی دستار بھی تو تھا
ظلمت سے یہاں برسرپیکار بھی تو تھا
میں نیند کا مارا ہوا بے نام مسافر
تو میری زباں تھا میرا اظہار بھی تو تھا
احساس ہوا ہے تجھے ہاتھوں سے گنوا کر
اس رات میں اک دولت بیدار بھی تو تھا
مینار صداقت تھا میرے جھوٹ نگر میں
دشمن پہ لٹکتی ہوئی تلوار بھی تو تھا
صحراؤں میں بہتا ہوا سوچوں کا سمندر
ملاح بھی تو، ناؤ بھی پتوار بھی تو تھا
ظالم سے بغاوت تیری فطرت تھی، انا تھی
اس باب میں اک حرف طرح دار بھی تو تھا
برسوں تجھے روئیں گی یہ بے چین ہوائیں
اجڑے ہوئے اس شہر کا پندار بھی تو تھا

ممتاز کنول

2010